نصرت آرا

ملنے کے پتے

(۱) دفتر صبح نو پوسٹ بکس نمبر ۴۲، پٹنہ ۴

(۲) نصرت آرا معرفت سید نصر الہدیٰ
جمال روڈ، پٹنہ ۱۔

(۳) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

درد کا رشتہ :- نصرت آرا

اشاعت :- بار اول ستمبر ۱۹۷۳ء

تعداد :- ۱۰۰۰

قیمت :- تین روپے

ناشر :- مکتبہ صبح نو، پوسٹ بکس ۱۲۲ پٹنہ ۴ (بہار)

مطبع :- لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ، پٹنہ

کتابت :- ہدایت کریم - عبدالستار شمیم

فہرست

اخلاقی قدروں کی توڑ پھوڑ کا الزام ہے

نصرت آرا

تعارف

از جنابِ علیم اللہ حالی

نصرت آرا کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے، اس میں بیشتر افسانے وہ ہیں جو ادھر دو تین برسوں میں مختلف مشہور و غیر مشہور جریدوں میں چھپ چکے ہیں، کم ہی افسانے لکھ کر نصرت آرا نے تیزی کے ساتھ شہرت کے زینے طے کرنے شروع کر دئے ہیں اور اب تک بعض مقتدر پرچوں میں قارئین کی جو رائیں دیکھنے کو ملی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ تمام قارئین سے تعریف و تحسین کے کلمات حاصل کر رہی ہیں لیکن سچا فنکار نہ عجلت آمیز شہرت کو پسند کرتا ہے اور نہ عام تعریفوں سے بہلتا ہے، مجھے نصرت آرا کی تخلیقی کارکردگی پر پورا بھروسہ ہے اس لئے ان سے اس طرح کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ غزل کہنے کی طرح افسانہ لکھ لینا بھی ایک نہایت آسان کام ہے، ایک نہایت معمولی ہنرمندی اور صلاحیت رکھنے والا فرد بھی بغیر کسی محنت کے کہانیوں کا انبار لگا سکتا ہے لیکن جس طرح اچھے غزلیہ اشعار کہنا جوئے شیر لانا ہے اسی طرح بہتر افسانے تخلیق کرنا بھی از حد دشوار ہے

اسلئے کسی ایسے فنکار سے جس کی مشق ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے کسی ناقابل فراموش اور عظیم تخلیقات کی توقع غلط ہوگی نصرت آرا سے بھی قارئین کو ابھی اس کی توقع نہیں کرنی چاہئے مگر ہم اتنا جائزہ ضرور لیں گے کہ ایک فنکار ہونے کے ناتے ان میں تجربات کے انجذاب، مشاہدات کے انتخاب و قبول، احساسات کی گیرائی اور اظہار و بیان کی قدرت کے امکانات کس حد تک پائے جاتے ہیں۔

کاروان شعر و ادب دورِ حاضر تک پہنچتے پہنچتے اپنا سفر طے کر چکا ہے کہ اب فنکاری کی ابتدائی منزلوں میں بھی جدید فنکار کو ایسے کرشمے دکھلانے پڑتے ہیں جو دامن دل کو کھینچ سکیں، اس لحاظ سے تخلیق کا PROCESS اس زمانہ میں ماضی کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار گزار ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے فنکار کا ذہن اپنے دور کے عام افراد کے ذہنوں سے زیادہ بالیدہ اور ترقی یافتہ ہوتا ہے، جیوں جیوں سماجی شعور بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اور اسی تناسب میں فنکار کی ذہنی سطح بھی اونچی ہوتی جاتی ہے شعور کے سفر میں ہر قدم اس دوری منزل کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس فاصلہ کا انتہائی متوازن ہونا بھی لازمی ہے۔ ایک طرف فنکار کی رفتار عام قاری کی رفتار سے تیز تر ہونی چاہئے اور دوسری طرف اسے اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں ہے جدید ترین دور کے فنکاروں پر یہ زبردست الزام ہے کہ وہ قاری کو چھوڑ کر یا آگے نکل جاتے ہیں یا ایسی سمت میں غائب ہو جاتے ہیں جہاں

کس نہ دانست کہ منزل گہہ مقصود کجا است

یہ عدم توازن کی دلیل ہے، مقام شکر ہے کہ نصرت آرا بہتر تخلیق کے اس PROCESS سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کے افسانوں میں بھرپور قصہ پن

(Story element) موجود ہے جس سے قاری ان وقوعوں کی دنیا میں داخل
ہوتا ہے جہاں سے فنکار نے تجربہ و احساس کی دولت سمیٹی ہے۔ اس طرح نصرت آرا
کے افسانے زیادہ سے زیادہ (Readable) ہیں۔ انھوں نے عام سماجی زندگی کے
تانے بانے سے اپنے افسانوں کو جنم دیا ہے، سماجی زندگی کی اس تصویر میں ازدواجی
تعلقات یا مرد و عورت کے ازلی رشتہ کی جھلکیاں بار بار نظر آتی ہیں، انھوں نے
جنسی بے راہ روی اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کے گھناؤنے اور کربناک مناظر
بھی پیش کئے ہیں مگر ان کا Treatment جو انسانی قدروں کی حفاظت کی
طرف نشاندہی کرتا ہے، سماج کے ایسے واقعات کی پیشکش اگر صرف حقیقت نگاری
کے تحت بھی کی جائے تو ان سے بنی بنائی اخلاقی قدروں پر ضرب لگنے کا اندیشہ ہے،
نصرت آرا نے انہیں بیان کرتے ہوئے ایک تعمیری اور اصلاحی نقطہ نظر سے کام لیا
ہے، اصلاح و تعمیر کا یہ جذبہ ان کے بیشتر افسانوں کو ایک مخصوص انجام کی طرف لیجاتا
ہے، بسا اوقات ایسا بھی احساس ہوتا ہے کہ اصلاحی تحریک کے تحت تعین شدہ نتائج
افسانوں میں یکسانیت بھی پیدا کر رہے ہیں اور انہیں حقیقت نگاری کے راستہ سے موڑ کر عینیت
نگاری کی طرف پہنچا رہے ہیں۔ ان کے یہاں ایک خراب کردار لازمی طور پر اپنے کیفر کردار کو پہنچ
جاتا ہے، کبھی وہ اپنے برے اعمال کے نتیجہ میں مادی اور خارجی طور پر نقصان اٹھاتا ہے اور
کبھی ظاہری کامیابی کے بعد بھی وہ ان اعمال کے انجام میں ایک ذہنی اور روحانی کشمکش میں
مبتلا رہتا ہے، غرض کسی نہ کسی شکل میں وہ نیکی و بدی کی پیکار میں نیکی کی فتح اور بدی کی ہار ضرور
دکھا دیتی ہیں، انہیں اپنے کرداروں سے زیادہ اپنے اصولوں اور آدرشوں سے محبت ہے۔

اس دور میں جب ہر طرف قدروں کی شکست و ریخت ہو رہی ہے نصرت آرا
کے یہ تعمیری مقاصد ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے اس رجحان پر پورا پورا

درد کا رشتہ

اطمینان ہے، مجموعہ کا انتساب بھی وہ نئی نسل کے ان افراد کیلئے کرتی ہیں جو ردّ اقدار میں سماجی اور ادبی ہر حیثیت سے فعال سمجھے جاتے ہیں، وہ یہ چاہتی ہیں کہ نئی آگاہی منفی جہت میں کام نہ کرے بلکہ اس سے انسانیت کی بقا کا کام لیا جا سکے۔

نصرت آرا کے کردار سادہ ذہنیت ہیں، یہ سماج کے وہ بھولے بھالے لوگ ہیں جو پرانے رسم و رواج میں پابند ہیں، یہ پابندی ان کی تقدیر بن چکی ہے، وہ اس پر صابر و شاکر ہیں، وہ ان بندشوں کو توڑنا ایک جرم سمجھتے ہیں۔ جب کبھی کبھار کوئی کردار ان رسم و رواج کو اپنے جبلی اثرات میں آکر توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا سارا وجود لرز جاتا ہے اور نتیجہ میں اسے بدتر نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کرداروں نے سماج کے اصولوں کو ایک Destiny سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ ایسے ماحول میں کسی بڑے انقلاب کا تصور تصورِ محض ہی ہے۔

نصرت آرا نے کم سے کم کرداروں کے ذریعہ سماجی حقیقت کے متعدد پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا ہے، ان کے افسانوں میں امیری اور غریبی، غلامی و آزادی، عورت اور مرد، محبت و مصلحت اور زن و شو کے مسائل و تعلقات کی گوناگوں شکلیں دکھائی دیتی ہیں، قماش کے لحاظ سے اتنے کم کرداروں کے ذریعہ ان ساری حقیقتوں کے اظہار کی قدرت نصرت آرا کے روشن مستقبل کی علامت ہے۔

نصرت آرا کے افسانوں میں ایک چیز اور بھی قابل غور ہے۔ طبقاتی کشمکش اور سماجی سطح پر تصادم سے زیادہ ان کے کرداروں میں خود اپنے آپ سے متصادم ہونے کی ایک نفسی کیفیت کی عکاسی ہے۔ قصہ کرداروں کو ایک ایسی فضا میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ ایک روحانی اور ذہنی تناؤ (TENSION) سے دوچار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار گناہ کے مرتکب ہونے کے باوجود قاری کی نگاہ میں

سدکارشتہ

بھلے لگتے ہیں، اپنی ذات سے یہ انوکھی لڑائی ان کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے۔

اگر اس بنیادی رجحان و موضوع کو کچھ اور باریکی اور فنکارانہ اخذ و انتخاب کے ساتھ پیش کیا جائے تو اسے خاصا آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور اس طرح ایک مخصوص روش میں ممتاز مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔

نصرت آرا کو ابھی بہت آگے جانا ہے، اس تخلیقی سفر میں جہاں ان کی فطری اختراعی صلاحیت ان کا ساتھ دیگی وہاں مطالعہ سے بھی خاصی مدد ملے گی، میرا مشورہ ہے کہ انہیں مشہور عالم ادبی تخلیقات کو پڑھنا چاہیئے، انہیں جدید دور میں صنعتی انقلاب، پیداوار کے ذرائع بڑھتی ہوئی آبادی، نئی بلادی تہذیب کے فروغ اور قدیم آسودگی بخش دیہی اور چوپالی کلچر کی موت کے مسائل اور ان سے پیدا ہونیوالے نتائج پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور تب مجھے یقین ہے کہ ان کے فن میں زندگی کا زیادہ سچا زیادہ وسیع اور زیادہ دلکش نقشہ ابھر سکے گا۔

علیم اللہ حالی

۶ ستمبر ۱۹۷۳ء

دردکا رشتہ

"ابّی! میں آپ کا درد سمجھتی ہوں۔"

روحی ابھی ابھی مجھے دلاسا دے کر گئی ہے۔ نو دس سال کی معصوم بچی کی زبان سے یہ جملہ سن کر میرے تڑپتے ہوئے دل کو قرار آگیا ہے۔ ہر خوف ہر اندیشہ مٹ گیا ہے اور ان کی جگہ میری زندگی کے افق پر امید کا سورج جگمگانے لگا ہے۔

روحی کو میں جب دیکھتا ہوں، میرے دل میں ایک عجیب احساس جاگتا ہے۔ ان جانے ان دیکھے غموں کا احساس۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی بچی نیلو یاد آتی ہے۔ حالانکہ دونوں میں کوئی مشابہت نہیں ہے، نیلو کا رنگ سانولا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی، کنول سی تھیں۔ روحی کا رنگ گندمی ہے۔ اس کے بال سیاہی مائل بھورے ہیں۔ آنکھیں بڑی ہیں نہ چھوٹی۔ دونوں کی تہذیب، دونوں

کا تمدن، سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ نیلو بنگالی تھی۔ اور روحی بہاری ہے۔ لیکن اس فرق کے باوجود دونوں مجھے ایک سی لگتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ دونوں میری اپنی ہیں۔

آج سے پچیس چھبیس سال قبل نیلو بھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ میری پیشانی پر رکھ کر میری طرف جھک آتی تھی۔ "پپا! آپ اداس ہیں میں خوب سمجھتی ہوں۔" اور میں زندگی کے جو تلخ گھونٹ پی پی کر نڈھال ہوتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ مجھے سکون سا آجاتا تھا۔

ان دونوں زندگی کیا تھی۔ ہندوستان آزاد ہوا تھا۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ غلامی کی تاریکی کی راہ سے ہو کر آزادی کی سحر آئی تھی۔ لیکن یہ سحر کتنی داغ دار تھی۔ کوئی ہم جیسے دیوانوں سے پوچھتا۔

جب میں نے چاٹگام میں اپنے مکان کی چھت سے سنیل کے مکان کو جلتے ہوئے، اس کی جوان بہن کو رفیق کی آغوش میں تڑپتے ہوئے، اس کی بوڑھی ماں (جس کو میں اور رفیق دونوں ماتا جی کہتے تھے) کو فریاد کرتے ہوئے اور سنیل کو اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو میرے دل پر کیا بیتی تھی۔ یہ میں خود نہیں سمجھ پاتا۔

سنیل اور رفیق دونوں میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ قاتل اور مقتول دونوں میرے اپنے تھے۔ دونوں کے درمیان میں تنہا کھڑا سوچتا رہا۔ میں دونوں میں سے کسی کے بھی کام نہیں آسکتا تھا۔ کسی کی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

رفیق کا ساتھ دینے کو میرا ضمیر تیار نہیں تھا۔ اور سنیل کی مدد کرنے میں میری جان کو خطرہ تھا۔ میری روح اس کاری وار کو سہہ نہیں سکی تھی۔ اور میں، بے دم سا ہو کر اپنے بستر پر گر گیا تھا۔

اسی لمحہ میرے کانوں میں کوئل کی کوک رس ڈالتی:

"پپا! آپ اداس ہیں، میں سب کچھ سمجھتی ہوں ــــ پپا! ہنس دیجئے ــ"

اور میں سب کچھ بھول کر ہنس دیتا۔ میں یہ بھول جاتا کہ میرے زخموں سے تازہ خون کے چھینٹے ابھی تک رس رہے ہیں۔

جب میں اپنی زندگی کی راہ پر چلتے چلتے تھک سا جاتا تو میرا جی چاہتا کہ میرا بھی کوئی ہوتا، جسے میں اپنے دکھ، اپنے درد میں شریک کر لیتا۔ تو میری نظر مونا پر آ کر رک جاتی ــــ مونا، میری جیون ساتھی، میری نیلو کی ماں۔

لیکن مونا کے پاس میرے لئے تلخیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میری ہر بات مونا کو بُری لگتی تھی۔

"پپا! ممی آپ پر ہر وقت غصہ کیوں کرتی ہیں؟" نیلو مجھ سے پوچھتی میں نیلو کی طرف دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میں اسے کیوں کر بتاتا کہ طاقت ور نے ہمیشہ کمزور کو دبایا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ جاتے، جب میرے ماں باپ نے مجھے مونا کے والدین کو سونپ دیا تھا۔

مونا اپنے دولت مند والدین کی اکلوتی بیٹی اور میں غریب ماں

باپ کا ہونہار بیٹا۔ میں نے ان دنوں میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اور میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا۔ لیکن میرے والدین کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ مونا جوان ہو چکی تھی۔ اور اس کے لئے مونا کے والدین کو ایک ہونہار لڑکے کی ضرورت تھی۔ وہ لوگ میرے مستقبل کا بار اٹھانے کو تیار تھے۔ شرط صرف یہ تھی کہ میں گھر داماد بن جاؤں۔ یوں میری شادی مونا سے ہو گئی۔ اور میں اپنے خاندان کو چھوڑ کر مونا کے گھر آ گیا۔

تعلیم جاری رہی۔ میری زندگی خارجی طور پر سنورتی رہی۔ میں ڈاکٹر بن گیا۔ لیکن میری روح زخم کھاتی رہی۔ مونا یہ کبھی نہ بھول سکی کہ مجھے اس سے نہیں اپنے مستقبل سے محبت تھی!!

مونا کے طعنوں سے عاجز آ کر میں بغاوت پر اتر آیا۔ میں مونا سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں مونا کو تڑپتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے عورتوں کا سہارا لیا۔

"پاپا! آپ ممی سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟" نیلو کے یہ پوچھنے پر میں تڑپ کر رہ جاتا۔ میں اسے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ کمزور نے ہمیشہ طاقت ور سے نفرت کی ہے۔ غالب اور مغلوب میں کبھی محبت کا رشتہ نہیں قائم ہو سکتا ہے۔

آخر ایک دن ساری الجھنوں سے دامن چھڑا کر میں لندن آ گیا۔ جہاں روشن مستقبل میرا انتظار کر رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن مجھے نیلو کا خط ملا۔

"پاپا! میں آپ کے گھر سے رخصت ہو کر اپنے گھر جا رہی ہوں۔ کیا آپ وداع کرنے نہیں آئیں گے؟"

میں نیلو کو رخصت کرنے کے لئے بارہ برس بعد اپنے وطن لوٹا۔

نیلو رخصت ہو گئی۔ اور میں دوسرے دن لندن واپس آ گیا۔

مونا نے مجھے روکنا چاہا۔ لیکن میں مونا کی خواہش کیوں کر پوری کر سکتا تھا، مجھے مونا سے نفرت تھی۔

میرے لندن واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد مجھے نیلو کا تار ملا۔

—— مونا کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔

نیلو کے خط آتے رہے' وقت آندھی کی طرح اڑتا رہا۔ اس مدت میں نیلو دو بچوں کی ماں بھی بن گئی۔ لیکن ایک دن میرا سکون مجھ سے چھین گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے وطن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ سب کچھ جل رہا ہے۔ یہ آگ بھڑکتی گئی۔ پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ میرا پورا چمن جل گیا ——

جب آگ بجھی تو میں شاید پہلا مسافر تھا جس نے اپنے اجاڑ "گلشن" میں قدم رکھا تھا۔ نیلو کو دیکھنے کی خواہش مجھے چاٹگام کی سڑکوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرا تڑپتا ہوا دل نیلو کو تلاش کر رہا تھا لیکن نیلو نہیں ملی۔ نیلو اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ شہید ہو گئی تھی۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں بے ہوش نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ میرے دل کی دھڑکن نہ رکی نہ بڑھی۔ سب کچھ پہلے ہی،

جیسا رہا۔ ہاں مجھے ایسا ضرور لگا کہ میری پوری زندگی میں ایک خلا سا ابھر آیا ہے۔ ایسا خلا، جو اب کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے مجھے کسی اپنے کی ضرورت تھی۔ کاش میرا کوئی ہوتا!

زندگی میں پہلی بار مجھے مونا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شاید اس لئے کہ یہ غم، یہ دکھ، میرا اور مونا کا یکساں غم تھا۔ میرے قدم خود بخود مونا کے خاندانی قبرستان کی طرف اُٹھ گئے۔ مونا کی قبر کہاں تھی، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں مونا کو ڈھونڈتا رہا۔ لیکن مونا نے میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو کہیں نہیں روکا۔

اسی درمیان میرے کانوں میں سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

شاید مونا رو رہی تھی۔ میں سسکیوں کی آواز کی طرف بڑھا۔

نو دس سال کی ایک بچی اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بُری طرح رو رہی ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس لڑکی نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ اور مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"مجھے بنگلہ بولنا آتا ہے۔ میں بنگلہ پڑھنا بھی جانتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجیے۔ مجھے مت ماریئے!" وہ لڑکی بنگالی زبان میں فریاد کر رہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی بنگالی نہیں تھی۔ ـــــ مجھے ایسا لگا جیسے نیلو اپنے قاتل سے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی مانگ رہی ہے۔

"بیٹی! تم کون ہو اور کیوں رو رہی ہو؟" میں نے اردو میں سوال کیا۔

اس لڑکی کی کچھ ڈھارس بندھی اور وہ پھوٹ پڑی ـــــ

انہوں نے میرے امّی ابّی کو مار ڈالا ۔ میرے ننھے منّے بھائی شہید کر دیئے گئے ۔ میرا اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ۔ میں اکیلی ہوں ـــــ"

" میں اکیلی ہوں ـــــ" میں بھی تو تنہا تھا ۔

میں اس بچی کو لے کر ہمیشہ کے لئے لندن لوٹ آیا ۔ راستے میں مجھے بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ بنگالی اور بہاری کا ساتھ لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرتا رہا ۔

لندن میں بھی میرے دوستوں ، میرے جاننے والوں نے مجھے حیرت سے دیکھا ۔ سب کی نظروں میں میں دیوانہ تھا ۔

لیکن ایک ہفتہ پہلے میرے بچپن کے دوست رضا نے جب مجھ سے پوچھا کہ میرے اور روحی کے درمیان کون سا رشتہ ہے تو میں بھی سوچ میں پڑ گیا ۔

رضا کا خیال ہے کہ میرے اور روحی کے درمیان محبت کا رشتہ کیونکر قائم ہو سکتا ہے ، جب کہ روحی میری نیلو کی قاتل ہے اور میں روحی اور اسکے والدین کا قاتل ہوں ۔ رضا میرے اور روحی کے درمیان صرف ایک رشتے کو مانتا ہے ۔ اور وہ نفرت کا رشتہ ہے ۔

رضا نے میرے دل میں بھی اندیشہ جگا دیا ۔

آج میں انھیں خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ روحی دھیرے دھیرے

میرے پاس آئی اور میری گود میں سر رکھ کر سسک اٹھی،

" امی! آپ اداس ہیں ــــ امی ہنس دیجیے، سب کچھ بھول جائیے ــــ امی میں آپ کا درد سمجھتی ہوں ــــ "

یہ سن کر مجھے قرار آگیا۔ کیوں کہ میرے سوال کا جواب مجھے مل گیا تھا۔
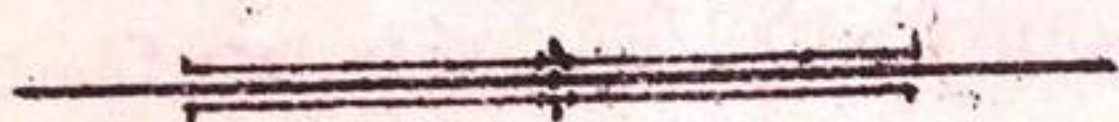
کانٹے

ابھی ابھی اعجاز مجھ سے ناراض ہو کر گئے ہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ میں اداس رہتی ہوں۔ پریشان رہتی ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ کون سا غم ہے۔ جو مجھے کھائے جا رہا ہے۔ کون سا درد ہے جو مجھے پگھلائے جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے خوش رہنا چاہئے۔ انھیں تعجب ہے دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی چاہے پالے اور پھر اداس رہے۔ اعجاز میری تمنا تھے میں نے ان کی چاہ کی تھی۔ اور وہ میرے ہو گئے۔ لیکن انھیں پا کر بھی میں خوش نہیں ہوں۔ مطمئن نہیں ہوں۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں لیکن ہنس نہیں پاتی ہوں۔ لیکن میں انھیں کیسے سمجھاؤں کہ میرے پورے جسم میں، میرے دل میں میرے دماغ میں کانٹے سے چبھتے رہتے ہیں۔ اور وہ کانٹا تمہارے پیار کا، تمہاری چاہ کا کانٹا ہے۔ تم جس نے مجھے چاہا، مجھ سے پیار کیا، مجھ سے، جس نے سدا تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے۔ آج تمہارا پیار مجھے کانٹا بن کر چبھ رہا ہے

تم میری خالہ کے لڑکے تھے۔ میری امی نے مرتے وقت ہم دونوں

کی منگنی کردی تھی۔ ہمارا خاندان روایت پسند ہے۔ ہمارے یہاں منگنی کو نکاح کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے منگنی کے بعد ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ منگنی کے وقت میری عمر ۸ سال اور تمہاری بارہ سال تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ ہم دونوں بڑے ہوتے گئے۔ ایک دن یہ بھی آیا کہ ابا نے خالہ امی کو یاد دلایا کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ خالہ امی کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک عجیب بات ہوئی، تم نے انکار کر دیا۔ تمہارے انکار نے پورے خاندان میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ ہمارے یہاں ابھی تک یہ نہیں ہوا تھا۔ خاندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ابا کا سر فکر سے جھک گیا۔ ابا، خالہ امی اور میں جہاں بھی جاتے لوگ ہمیں دیکھ کر سرگوشیاں کرتے۔ مجھ سے یہ ذلت یہ شرمندگی نہیں سہی۔ اور میں نے تم سے بات کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ایک رات لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر میں تمہارے پاس پہونچ گئی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ تم جاگ رہے تھے۔ تمہارے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ اور آس پاس ان گنت سگریٹ کے ٹکڑے تم نہ جانے خلاؤں میں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟ تمہاری آنکھیں سونی سونی تھیں۔ تمہارے ہونٹ تمہارے دانتوں تلے دبے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے تمھیں غور سے دیکھا۔ تم کتنے بے بس اور مجبور نظر آرہے تھے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل میں کتنا پیار امڈ آتا ہے۔ اسی طرح میرے دل میں تمہارے لئے محبت کا جذبہ جوش مارنے لگا۔ میں نے بہت چاہا۔ بے انتہا پیار سے تمہاری

طرف دیکھا، تم مسکرا اٹھے، اتنی کھوکھلی مسکراہٹ میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی کبھی نہیں دیکھی۔

تم نے پوچھا "کیسے آئیں؟"

"یہ سب کیا کیا" میں نے جواب دیا۔ جو ڈر، جو خوف تم سے ملنے سے قبل تھا، وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ مجھے تمہارے سامنے اب ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک خود اعتماد ڈاکٹر کو مریض کے سامنے ہوتا ہے۔

تم نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور چھت کے طرف تکنے لگے میں زور دیتی چلی گئی۔ لیکن تم خاموش رہے۔ آخر میں غصے میں تم سے الجھنے لگی۔ تب تم نے کہا "میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ کہیں بھاگ جاتا یا تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا۔ بھاگوں تو کیسے بھاگوں؟؟ اماں کو نھی کو کس پہ چھوڑ دوں؟ اس لئے انکار کر دیا۔"

"لیکن کیوں؟ کیوں؟؟" میں تکرار کرتی گئی۔

تم دانتوں تلے ہونٹ دباتے چلے گئے۔ تمہارا سارا جسم لرزتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم گر پڑو گے۔ تب میں نے دونوں ہاتھ تمہارے کاندھے پر رکھ دیئے۔

تمہیں سہارا ملا تو کچھ پر سکون ہوئے۔ میری طرف غور سے دیکھا اور تمہاری لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تمہیں جنسی تسکین بخشنے سے معذور ہوں۔" تم نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

تھوڑی دیر کے لئے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ میں اس خاندان سے وابستہ ہوں، جہاں لڑکیوں نے ایک سے ایک قربانی دی ہے۔ میں نے ایک فرض شناس اور اصول پرست انسان کی طرح جذبوں کو قتل کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ "میں سدا تمہاری تھی، تمہاری ہی رہوں گی۔ مجھے پیار چاہیئے، صرف پیار اور کچھ نہیں۔"

تم ہنسے۔ "سوچ لو، سمجھ لو۔"

میں نے کہا۔ "تم مجھے نہیں اپناؤ گے تو میں جان دے دوں گی۔"

تم نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

کچھ دن بعد میں تمہارے گھر میں دلہن بن کر آگئی۔ مجھے سہاگ کی رات ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب تم نے گھونگھٹ الٹتے ہوئے بہت بے بسی کے ساتھ کہا تھا۔

"تمہیں کیا دوں؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "تم بھول گئے، میں نے کہا تھا۔ مجھے پیار چاہیئے، صرف پیار۔"

یہ سن کر تم میرے چہرے کی طرف جھک آئے۔ میرے کانوں میں تمہاری لرزتی ہوئی آواز رس گھولتی گئی۔ "پیار! اتنا پیار دوں گا کہ تم گھبرا جاؤ گی۔ اتنی چاہتیں دوں گا کہ تم ان چاہتوں تلے دب جاؤ گی۔ میری محبت کانٹا بن کر تم کو چبھنے لگے گی۔"

اور تم گود بھر کر اپنا پیار مجھ پر لٹانے لگے۔ میرا سر دکھتا تمہاری جان نکل جاتی۔ میں کسی چیز کی طرف اتنا نظر بھر دیکھ لیتی، تم وہ چیز مجھے فوراً لا دیتے۔ میں کسی کو غصہ کی نگاہ سے دیکھتی تم اسے مار بیٹھتے۔

لیکن شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھے کچھ اور چاہیے۔ مجھے ایسا لگتا کہ میرے ہونٹ جل رہے ہیں۔ لہک رہے ہیں۔ میرا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ پیاس کی شدت سے میرے حلق میں کانٹے سے چبھتے رہتے۔ تمہاری قربت میرے لئے قیامت بن جاتی۔

میری محبت میری اپنی ہی آگ میں پگھلنے لگی۔ آہستہ آہستہ مجھے تم سے پہلے وحشت اور پھر نفرت ہونے لگی۔ میں تم سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں تمہیں کچوکے لگاتی، تم پر حملہ کرتی، طنز کرتی۔ لیکن تم خاموش رہتے یا مسکرا پڑتے، تمہاری مسکراہٹ مجھے اور طیش دلاتی۔

اسی درمیان تمہارا چچازاد بھائی، اعجاز تم سے ملنے آیا۔ نہ جانے کیسے میں اور اعجاز ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ تم گھر میں موجود رہتے۔ لیکن میں اپنا سارا وقت اعجاز کے ساتھ گذارتی۔ تم یہ سب دیکھتے لیکن کچھ نہیں بولتے۔ تم نے مجھے کبھی نہیں روکا۔ کبھی نہیں ٹوکا میں اعجاز کی طرف بڑھتی گئی، شاید تم سے یہ سب نہیں دیکھا گیا۔ تم نے گھر میں آنا بہت کم کر دیا۔

اعجاز لوٹ گئے۔ لیکن اپنی چاہت، اپنا پیار، یہاں تک کہ اپنی نشانی مجھے سونپ گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دنوں بعد میری طبیعت خراب

رہنے لگا۔ ایک دن حکیم صاحب مجھے دیکھنے آئے۔

میرے کانوں نے سنا۔ "صاحب! مبارک ہو! گھر میں امید سے ہیں۔" خالہ امی تمہیں بلائیں لینے لگیں۔ نبھی مجھ سے لپٹ گئی۔ لیکن میں جہنم کی آگ میں جل رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تمہاری طرف دیکھا۔ تم بالکل خاموش تھے۔ تم اتنے پرسکون ہو رہے تھے کہ مجھے اطمینان اور سکون سے خوف محسوس ہونے لگا۔

ان دنوں تم نے مجھے کتنے ناز و نعم سے رکھا۔ میں کیسے بتاؤں۔ شاید کوئی باپ اپنے بچے کے لئے اتنا کرتا ہوگا۔ جو تم دوسرے کے بچے کے لئے کر رہے تھے۔ تم نے اپنے کسی بھی انداز سے نہیں ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں تمہاری نظر میں اپنا مقام کھو چکی ہوں۔ تم اپنے خزانے سے پیار کا موتی مجھ پر نچھاور کر رہے تھے۔ میرے سہارے تم ہنستے رہے۔ مسکراتے رہے، لیکن اب میرا جی چاہتا تم مجھ سے نفرت کرو۔ ڈانٹو، پھٹکارو۔ لیکن تم تو اپنا وعدہ وفا کر رہے تھے۔ میری راہوں میں اپنے پیار کا کانٹا بچھا رہے تھے۔ اپنی چاہتوں کے بوجھ سے مجھے دبائے جا رہے تھے۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور ایک دن پورے گھر میں شادیانے بج اٹھے۔ خدا نے مجھے چاند سا بیٹا دیا تھا۔ دائیاں زچہ خانہ گا رہی تھیں۔ کہ نبھی تھیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ نبھی تم سے سونے کے کنگن کی فرمائش کر رہی تھی خالہ امی تمہیں دعائیں دے رہی تھیں۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہارا

چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہے۔
میں نے دیکھا کہ ننھی تمہاری گود میں بچے کو ڈال رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو "رہنے دو، ننھی رہنے دو" یک بیک تمہاری نظر میری نظر سے ٹکرائی، تمہارے خیال میں آیا کہ شاید یہ بات مجھے ناگوار گذرے اور تم نے بچے کو گود میں لے لیا
خالہ امی، ننھی، سبھی چلی گئیں۔ صرف تم اور ہم رہ گئے۔ میرے گناہوں کے بوجھ نے میری پلکوں کو بند کر دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ تم میری طرف جھک رہے ہو۔ میں کانپ گئی کہ کہیں تم میرا گلا نہ دبا دو۔ لیکن میری جلتی ہوئی پیشانی پر تم نے اپنے ٹھنڈے ہونٹ رکھ دیئے۔

تم چلے گئے لیکن میری ہمت نہیں ہوئی کہ آنکھیں کھولوں۔ اتنی دیر میں منا رونے لگا۔ وہ روتا رہا۔ خالہ امی اسکی آواز سن کر آ گئی۔

"ہائے دلہن! تم سوئی ہو، منا بھوکا ہے۔ اسے سینے سے لگا لو" وہ دودھ پیتا رہا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ میرے گناہ دھل رہے ہیں۔ میرے جسم سے امرت کی دھارائیں بہہ رہی ہیں۔ اور مجھے نیند آ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو خالہ امی منا کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ تمہاری لاش سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی آنگن میں رکھی ہوئی تھی۔ تم جب میرے ابا کو منا کی پیدائش کی خبر دینے جا رہے تھے تو نہ جانے کیسے کار کھڈ میں گر پڑی۔

کچھ دنوں بعد جب تھوڑا سکون ہوا تو تمہارے کاغذات دیکھے گئے۔ تمہاری ساری چیزیں میرے نام تھیں۔

سال ہوتے ہوتے اعجاز مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔
اعجاز کے فراق میں نہ جانے کتنی راتیں میں نے جاگ کر گذاری تھیں۔
اعجاز کی قربت میں دامن بھر بھر کر پھول چنے تھے۔ اعجاز سے میں نے پیار کیا تھا۔ اعجاز سے محبت تھی، محبت ہے۔

لیکن اعجاز کو پا کر میرے دکھ اور بڑھ گئے۔ اعجاز اور دنیا والے سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں کو خدا نے ملایا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اسے مجھ سے کس نے ملایا ہے۔ کوئی جانے نہ جانے لیکن مجھے علم ہے کہ کار کا حادثہ کیسے ہوا، کیونکر ہوا۔؟

یہی علم مجھے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ ہر لمحہ یہ خیال مجھے ڈسے جاتا ہے۔ کوئی کانٹا ہے جو ہر لمحہ چبھ رہا ہے۔

گردش

آج جب میرے بال سفید ہو گئے ہیں۔ جب عمر کے بوجھ نے میری کمر کو دوہرا کر دیا ہے۔ اور زندگی میں ویرانی اور تاریکی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے، میں تمہارے سامنے اپنے دل کی کتاب کھول رہی ہوں۔

تم اور ہم دو نہیں تھے، دو نہیں ہیں۔ پھر بھی ہم دونوں کے درمیان کتنا طویل فاصلہ تھا۔ اور کتنی لمبی دوری ہے۔ اس کا احساس صرف ہم دونوں کو ہو گا، کسی اور کو نہیں۔ تم میرے چچازاد بھائی تھے، تمہارے ابا اور میرے ابا بھائی بھائی تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے دشمن۔ دولت نے بارہا بھائیوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا ہے، ہمارے یہاں بھی یہی ہوا۔ دادا ابا کے انتقال کے بعد ابا اور چچا ابا دونوں "راج گدی" پر تنہا قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی لئے دونوں ایک دوسرے کی نظر میں بے ایمان اور چور تھے۔ دو بھائیوں کی ہوس نے دو الگ خاندانوں کی بنیاد ڈالی۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے۔

لیکن ہائے رے انسان کا دل! ہمیشہ ان ہونے کھیل کھیلتا ہے ہمیشہ ایسے چاند کے لئے مچلتا ہے جس تک رسائی محال ہو۔ ہم دونوں بھی بڑے ہو کر ایک دوسرے کی تمنا کر بیٹھے۔ تم میرا راستہ روکنے لگے۔ اور میں خاموش رہ کر تمہیں بڑھاوا دیتی گئی۔ تم نے میری خاموشی کو نرم دیا سمجھا۔ اس لئے تمہاری دیوانگی بڑھتی گئی۔ پھر بات ہم لوگوں کے والدین تک پہنچی۔ ان کی آپس کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ میرے ابا نے سمجھا تم ان کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہ رہے ہو، اور تمہارے ابا نے سوچا کہ میرے ابا اس طرح ان کی دولت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور تم ڈاکٹر بن گئے اس کے بعد تمہارے باہر جانے کا ذکر ہونے لگا۔ لیکن تمہارے اماں ابا تمہیں کنوارہ نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں خاندان کا نام داغ دار نہ ہو جائے۔ اور جب تمہیں شادی کے لیے مجبور کیا گیا تو تم نے میرا نام لیا۔

سنا ہے، تمہارے ابا نے دو روز تک تمہارے اس گناہ کے باعث تم سے بات نہ کی تھی۔ لیکن پھر وہ تمہاری ضد کے آگے ہار گئے۔ تمہاری اماں ہمارے یہاں پیغام لے کر آئیں۔ ابا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لیکن میری اماں کی ممتا نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ میری رائے لیں اور اگر میں تمہیں پسند کر لوں تو وہ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں۔

تمہیں علم ہے کہ میں نے کیا رائے دی؟ میں نے تمہیں اپنانے سے انکار کر دیا۔ سنا ہے کہ جب تمہیں یہ بات معلوم ہوئی تو تم سکتے میں آ گئے۔

تمہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یقین کرو، تمہیں کیا، کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے، سب حیران تھے۔

خود مجھے حیرت تھی۔ کس نے خود امرت کا پیالہ توڑا ہے۔ کس نے اپنے ہاتھوں زہر پیا ہے۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دامن میں آگ لگائی تھی! اپنا پیار خود ہی اپنے سے دور کیا تھا۔

کچھ روز بعد تم سے کسی تقریب میں ملاقات ہوئی۔ تم مجھے دیکھتے ہی بری طرح برس پڑے۔ کیا کیا نہیں کہا، یہاں تک کہا کہ تم بدلہ لو گے اور ضرور بدلہ لو گے۔

اور اتنے دن بعد آج تم نے اپنا بدلہ لے ہی لیا!

آؤ آج تمہیں یہ حقیقت بتا دوں کہ میں نے تمہیں اپنانے سے کیوں انکار کیا؟ جانتے ہو، میرے انکار میں بھی چاہت تھی۔ میں نے انکار اس لئے کیا تھا کہ میں ایک موذی مرض میں مبتلا تھی۔ جسے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ یہ مرض صرف مجھ تک نہیں رہتا بلکہ میرے قریب رہنے سے تمہیں اور پھر تمہاری اولاد تک کو منتقل ہو جاتا۔ میں تمہیں اور تمہاری نسل کو برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔

میرے انکار کے بعد تم نے شاہینہ سے شادی کر لی۔ شاہینہ بہت خوبصورت اور پیاری لڑکی تھی۔ لیکن تم اس کے بعد بھی مطمئن نہ تھے۔ تمہارا چہرہ تمہارے دل کے درد کی غمازی کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد تم باہر چلے گئے۔

اس کے بعد ایک ماہر غیر ملکی ڈاکٹر سے میرا علاج ہو گیا۔ جلد ہی ماں باپ نے میری شادی بھی کر دی۔ ایک سال بعد میری گود بھر گئی۔ دنیا کی نظر میں میں بڑی خوش قسمت عورت تھی۔ چاہنے والا شوہر، محبت کرنے والے ساس سسر، گود میں ہنستا ہوا بچہ، اور خدمت کرنے کے لئے نوکر چاکر۔ عورت کی جنت یہی ہوتی ہے اور مجھے یہ سب کچھ میسر تھا لیکن میں اپنی جنت سے خوش نہ تھی۔ اپنے ہاتھ سے میں نے اپنے دل میں زخم جو لگایا تھا وہ اب ناسور بن چکا تھا۔ اور ہر وقت رستا رہتا تھا۔ دل جب خوش نہ ہو تو کچھ بھی نہیں اچھا لگتا۔ مجھے بھی اپنا گھر پسند تھا، نہ اپنے لوگ۔ میرے شوہر نے میری بے رخی اور بے اعتنائی، میری بے تابی اور بے قراری دیکھی۔ اور شاید وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ وہ بھی اسی آگ میں سلگنے لگے۔ جس میں میں جل رہی تھی۔ آخر میری بے مروّتی کی آگ نے میرے سہاگ کو سدا کیلئے جلا دیا۔

کچھ دن بعد میں سب کچھ بھول گئی۔ میرے سامنے میری ذمّہ داریاں تھیں۔ میرے آگے میرے بچّے کا مستقبل تھا ـــــ میں اس کے مستقبل کو سنوارنے میں جٹ گئی۔ تمہیں کیونکر بتاؤں، کیسے سمجھاؤں کہ کامران کے لئے میں نے کیا کیا کیا؟ کتنی راتیں اس کے لئے جاگ کر گذاریں۔ کس طرح اپنا سارا سکھ، اپنا سارا آرام اس پر نچھاور کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے دل کے زخم کو بھول گئی۔ خود کو بھول گئی۔ تم کو فراموش کر دیا۔

وقت گزرتا گیا اور کامران بڑا ہو گیا۔ وہ بھی ڈاکٹر بنا۔ اور

نوکری کے سلسلے میں اس شہر میں آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر ایس احمد کے تحت کام کررہا ہے۔

میں نے سنا کہ وہ ڈاکٹر ایس احمد کی لڑکی کو دل دے بیٹھا ہے جب ایک دن میں نے اس سے شادی کا تذکرہ کیا تو اس نے فوراً ڈاکٹر احمد کی لڑکی رخشی کا نام لیا۔

میں ڈاکٹر احمد کے یہاں اپنے چاند کی بات لے کر گئی۔ ڈاکٹر صاحب نہیں تھے، ان کی بیگم سے ملاقات ہوئی۔ بیگم بہت با اخلاق اور ملنسار تھیں، ان کی محبت نے مجھے بڑھاوا دیا۔ اور میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو آنے دیجئے۔ ان کے سامنے بات ہوگی۔ اسی درمیان رخشی آگئی۔ بیگم صاحبہ نے تعارف کرایا۔ اور میں اس لڑکی کو دیکھتی رہ گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ خوب صورت تھی، بلکہ اس لئے کہ میرے سامنے شاہینہ کھڑی تھی ــــ میں الجھن میں پڑگئی اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔

میرا اندازہ صحیح نکلا، ڈاکٹر صاحب تم ہی تھے۔

تمہاری بیگم نے میرے آنے کا مقصد بتایا ــــ تم مسکرا اٹھے، تمہاری مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے ایک شکاری کو شکار دیکھ کر آتی ہے، میں کانپ گئی۔ میرے کانوں میں تمہارا جملہ گونجنے لگا ــــ "میں بدلہ لوں گا۔"

تمہاری بیگم چائے لانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ تو تم

نے بتایا کہ تہمینہ بچی کی پیدائش کے وقت ختم ہو گئی تھی ـــــ یہ تمہاری دوسری بیگم ہیں۔ اس کے بعد تم کامران کی تعریف کرنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ کامران تمہیں پسند ہے۔ اور تم اسے اپنی زندگی میں قبول کر لوگے،

ہاں تم نے اپنی بیگم کو یہ نہیں بتایا کہ تم مجھے جانتے ہو، جب تم نے نہیں بتایا تو میں کیسے کہتی۔ جب میں جانے لگی تو تم نے کہا" جمعہ تک انتظار کیجیے" میں مطمئن تھی۔ تمہاری باتوں نے میری ہمت بڑھادی تھی۔

جمعہ کا دن آگیا۔ تمہارے یہاں سے نوکر مٹھائی کا طشت لے کر آیا۔ کامران نے پوچھا" کیسی مٹھائی ہے؟ جواب دیا" رخشی بی بی کا نکاح ہو گیا ہے۔ اس کی مٹھائی ہے"

آگے کیا لکھوں؟ تم خود سمجھ سکتے ہو، کامران پر کیا بیتی۔ تم خود اس دور سے گزر چکے ہو!

دو راتیں اور دو دن اس نے سکتہ کے عالم میں چھت تکتے ہوئے گزار دیئے۔ آج صبح جب میں اسے اٹھانے گئی تو وہ بے خبر سو رہا تھا میں مطمئن ہو کر لوٹ آئی۔ لیکن جب کافی وقت گزر گیا تو میرا دل ڈوبنے لگا میں نے اسے جا کر جھنجھوڑا۔ لیکن وہ نہ اٹھا۔ ہاں، مجھے نیند لانے والی گولیوں کی شیشی خالی پڑی مل گئی ـــــ مبارک ہو، تم نے اپنا بدلہ لے لیا مبارک ہو تم نے میری دنیا سونی کر دی۔

بس ایک بات پوچھوں کیا اسی کا نام محبت ہے؟

درد نگار شتہ

نہا کر جب وہ باہر آئی تو اس کی نظر گھڑی پہ آ کر ٹھہر گئی۔ پانچ بج رہے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ جب کہ وہ روز پونے پانچ بجے تک ضرور آجاتے تھے۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا ـــ کون جانے ....
.... اگر انہوں نے جو کچھ کہا ہے کر دکھایا تو......

اس نے ان ہی پسند کی ساری نکالی۔ ہری زمین پر سرخ اور عنابی پھول کی یہ جارجٹ کی ساری ابھی کچھ ہی دن ہوئے۔ انھوں نے اس کے لیئے لا کر دی تھی۔ ساری پہننے کے بعد اس نے ان ہی کی پسند کے مطابق جوڑا باندھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ جسم میں خوشبو لگائی اور ان کا انتظار کرنے لگی۔

چھ بج گئے، لیکن ابھی تک ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کا دل بہت تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ کہیں...... کہیں.... آگے

سوچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

وہ گھبرا کر آنگن میں آگئی۔ سارا کام ہو چکا تھا۔ میز پر ناشتہ سجا ہوا تھا۔ اسٹوو پر چائے کا پانی ابل رہا تھا۔ ایک برتن میں بیسن پھینٹا ہوا رکھا تھا۔ انھیں چائے کے ساتھ بیسن کے پکوڑے بہت پسند تھے۔ اس نے آج خاص طور سے ان ساری باتوں کا اہتمام کیا تھا۔ جو انھیں پسند تھیں۔ کیونکہ وہ اس سے خفا ہو کر گئے تھے۔

لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے تھے ــــ وقت گزارنے کے لئے وہ دوبارہ بیسن پھینٹنے لگی۔ وقت گزرتا رہا۔ لیکن وہ نہیں آئے۔

صبح بہت معمولی سی بات پر دونوں میں جھڑپ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ کل ان کی قمیض کا ایک بٹن ٹوٹ گیا۔ اور انہوں نے اس کو ٹانکنے کو کہا تھا۔ لیکن وہ بھول گئی۔ صبح آفس جاتے وقت قمیض نکالی تو انھیں بٹن ٹوٹا ہوا ہی ملا۔ بس ایک دم وہ بپھر گئے اور بگڑتے ہی چلے گئے۔ پھوہڑ، بدسلیقہ، کام چور اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ اس نے بھی عاجز آکر جواب دے دیا۔ "ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے! کسی صورت سے آپ سے پیچھا تو چھوٹے!"

بس پھر کیا تھا ایسا لگا گویا کسی نے تیل کے بھرے ہوئے کنستر میں چنگاری ڈال دی ہو۔

"ٹھیک کہتی ہو ــــ چھٹکارہ چاہتی ہو نا؟ تو آج کے بعد کبھی میری شکل مت دیکھنا ــــ اب میں گھر واپس نہیں آؤں گا ــــ اگر آؤں تو

دوسروں کے کاندھے پر آؤں گا۔ اب میری لاش ہی یہاں آئے گی۔ میں خود اس زندگی سے اوب گیا ہوں۔ آج ہی اس کا خاتمہ کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ غصہ میں باہر نکل گئے۔ ٹفن بھی ساتھ نہیں لے گئے تھے۔

تھوڑی دیر وہ بھی غصے میں تلملاتی رہی۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ ابال دھیما ہوتا گیا۔ ان کی محبت، ان کی چاہت ابھرنے لگی۔ دن بھر وہ ان کو یاد کر کر کے گھبراتی رہی ـــــ کہیں وہ سچ مچ وہی نہ کر بیٹھیں جو کہہ کر گئے تھے۔ پھر اس کا کیا ہوگا؟ وہ اس کے بغیر کیسے جئے گی؟

سات بج رہے تھے لیکن ان کی کہیں پرچھائی بھی نہیں تھی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا ـــــ وہ گھبرا کر دروازے تک آگئی۔ اور باہر دیکھنے لگی۔ پوری گلی سنسان ہو رہی تھی، چاروں طرف اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اسے ڈر لگنے لگا اور وہ اندر آگئی۔

آہستہ آہستہ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ نہیں آئیں گے۔ وہ اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اپنی ویران اور برباد زندگی اس کی نظروں میں پھرنے لگی اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اگر وہ تھوڑا برداشت کر لیتی تو کیا قیامت ٹوٹ پڑتی؟ اس میں ذرا بھی صبر ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

دل ہی دل میں اس نے خدا سے ہزاروں بار اپنے قصور کے لئے معافی مانگی۔ صدقِ دل سے اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ اب، ان سے

کبھی نہیں لوٹے گی۔ وہ کچھ بھی کہیں گے خاموشی سے سنتی رہے گی

لیکن وقت گزر رہا تھا۔ اور ان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ بے تاب و بے قرار پورے مکان میں ٹہل رہی تھی۔ آنسوؤں سے اس کا میک اپ خراب ہو رہا تھا۔ نئی ساری بھیگ رہی تھی، لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس یہ خیال ستا رہا تھا۔ کہ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔

اسی پریشانی کے عالم میں اسے کسی آہٹ کا احساس ہوا، کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا، دودھ والا دودھ لایا تھا۔

وقت سرکتا رہا۔ اس درمیان وہ کئی بار مری اور کئی بار زندہ ہوئی۔ اس کی نظروں کے سامنے اخبار کی خبریں آ رہی تھیں۔ فلاں آدمی نے ریل کے نیچے آ کر جان دے دی ـــ فلاں آدمی پانی میں ڈوب گیا۔ ان سب باتوں کے پیچھے گھریلو لڑائیاں تھیں۔ کبھی لگتا یہ سب جھوٹ ہے، وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ انہوں نے بارہا ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا وہ وعدہ بھول جائیں گے نہیں، کبھی نہیں۔

لیکن جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ ان کے بجائے کوئی اور شخص آئے گا اور یہ خبر دے گا کہ وہ.... آگے سوچنے کا اس میں حوصلہ ہی کہاں تھا ـــ

نو بج رہے تھے۔ یکایک اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز

سنی۔ وہ ڈر گئی ـــــ تو وہ لوگ آ ہی گئے! اب اس کو وہ منحوس خبر سنائی جائے گی۔ اس کی نظر آئینہ پر گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ بکھرے بال لئے سفید ساری میں لپٹی سہمی کھڑی ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈرتے ڈرتے اس نے دروازہ کھولا۔

سامنے وہ مسکراتے ہوئے کھڑے تھے۔

"معاف کرنا ـــ دیر ہو گئی۔ آتے وقت راستے میں راجو اور اشتیش مل گئے۔ کم بخت زبردستی سینما لے گئے۔"

لیکن اس کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ اور رُندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا۔ کہ اب آپ کبھی نہیں آئیں گے۔ صبح آپ یہی کہہ کر گئے تھے نا؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا، اب میں آپ سے کبھی نہیں لڑوں گی۔"

"پگلی کہیں کی! میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ تم تو میری زندگی ہو۔ اچھا کھانا لاؤ، بھوک لگ رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے موگرے کا ہار جو وہ اس کے لئے بازار سے لائے تھے۔ اس کے جوڑے میں لگا دیا۔

کھانا لگ گیا۔ انہوں نے ابھی ایک نوالہ ہی کھایا تھا کہ وہ زور سے چیخے کہ کیا گھر میں نمک نہیں تھا۔ وہ اپنی دماغی الجھن میں شاید سالن میں نمک ڈالنا بھول گئی تھی۔

"کیا بد مزہ کھانا ہے۔ اگر ایسا ہی کھانا کھانا تھا تو مجھے شادی کی کیا ضرورت تھی؟ ہوٹل میں اس سے کہیں بہتر کھانا مل جاتا ہے۔"

"بس بس خاموش رہیے، زبان مت کھلوا ئیے۔ میں خود یہی سوچتی ہوں۔ کہ شادی کی کیا ضرورت تھی۔ کسی کے یہاں برتن جھاڑو کر کے بھی اس گھر سے زیادہ اچھی زندگی گذار لیتی۔ آپ کے ساتھ رہتے رہتے میں بھی عاجز آگئی ہوں۔"

"میں خود تم سے عاجز آگیا ہوں ایک دن اس گھر سے ہمیشہ کے لئے ہی چلا جاؤں گا۔"

"یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ میں تمہاری روز روز کی دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں......"

جب ضمیر جاگا

وہ آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑک بالکل سونی تھی۔ اس نے دانستہ اس سڑک کا انتخاب کیا تھا حالانکہ اس راستہ سے اسے اپنے گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو سکتی تھی لیکن جان اسے زیادہ عزیز تھی۔ اسے علم تھا کہ شہر کی وہ سڑکیں جہاں رونق رہتی تھی وہاں آج خون ہی خون نظر آ رہا ہے۔

کار اپنی منزل کی طرف آہستہ آہستہ رواں تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔ "شاید دوسروں کے لئے یہ حیرت کی بات نہ ہو لیکن اس شہر والوں کے لئے یہ بہت حیرت کی بات ہے۔ یہاں کے لوگوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یہ شہر صرف ایک مذہب والوں کے لئے ہے ان کے خیال میں یہ شہر سب کا تھا لیکن آج لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں! ایک دوسرے کا خون کر رہے ہیں۔ کیسی حیرت کی بات ہے جو کل تک اپنے تھے وہی آج غیر ہو گئے۔ اسے معلوم تھا کہ ایک پڑوسی نے دوسرے کا خون کیا ہے، ایک دوست نے دوسرے دوست کو مار ڈالا ہے!!"

کار آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اور اسی طرح اس کے خیالات

کبھی اپنے ماضی کے طرف لوٹ رہے تھے ـــــــ وہ اور احمد ـــــــ

اس کا گھر احمد کے گھر کے بغل ہی میں تھا۔ وہ احمد کے ابا کو چچا کہتا تھا۔ جتنی دوستی بابو اور چچا میں تھی اتنا ہی پیار اس میں اور احمد میں تھا۔ دونوں ساتھ کھیلتے، ساتھ پڑھتے اور ساتھ شرارت کرتے بابو اور چچا دونوں کو ساتھ سزا دیتے۔ عید، بقر عید آتی، ہولی دیوالی آتی، تو وہ دونوں ساتھ مل کر مناتے۔ دیکھنے والے جلد سمجھ نہ پاتے کہ یہ دونوں دو ماں باپ کے بیٹے ہیں، ان کا مذہب دو ہے، ان کے عقیدے دو ہیں۔

کار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے خیالات بھی آہستہ آہستہ رواں تھے۔

اس نے اور احمد نے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی اور دونوں کو ایک ہی دفتر میں نوکری بھی ملی۔ دونوں ساتھ دفتر آتے اور ساتھ گھر جاتے لیکن آج بھابی نے احمد کو دفتر نہ آنے دیا۔ اس نے بھابی سے پوچھا تھا "کیوں بھابی؟ مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟" بھابی نے جواب دیا "پرکاش بھیا! میں آپ کو نہیں روک رہی ہوں لیکن آپ مانئے تب نا،" سرلا نے بھی اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ رکا۔ لیکن دفتر پہنچنے کے بعد وہ پچھتایا۔ دفتر میں لوگ اس طرح ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے تھے جیسے یو۔ این۔ او میں روسی اور امریکی نمائندے کشیدہ رہتے ہوں گے!!

اس نے گھڑی دیکھی پانچ بج رہے تھے۔ اسے علم تھا کہ احمد اور سرلا اس کیلئے پریشان ہوں گے لیکن وہ کیا کر سکتا تھا؟ اگر دوسری سڑک سے گھر پہنچنے کی کوشش کرتا تب ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے گھر نہ پہنچ پاتا۔

اسے یاد تھا کہ احمد نے وقت پڑنے پر اس کی کتنی مدد کی ہے۔ ایک بار وہ

بیمار تھا تو اس کی تیمار داری میں احمد نے دن رات ایک کر دیا تھا اور جب اس نے احمد کا شکریہ ادا کرنا چاہا تب اس نے اسے کالج کا وہ واقعہ یاد دلایا جب ایک حادثہ میں احمد کا بہت سا خون نکل گیا تھا تب اس نے اسے اپنا خون دیا تھا۔ پاگل کتنی چھوٹی چھوٹی بات یاد رکھتا ہے!!"

کار آہستہ آہستہ ہوئے ہولے رواں تھی۔ اس نے دیکھا ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کوئی تقریر کر رہا ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر تقریر کرنے والے کا نام کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے مذہبی رہنما ہیں۔ اسے علم تھا کہ انہوں نے اپنے مذہب اپنے لوگوں کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ اسے خبر تھی کہ ان کی سب سے بڑی تمنا، سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ان کا مذہب ساری دنیا میں پھیل جائے یہی آرزو اس کی بھی تھی۔ اس کی کیا؟ یہ آرزو، یہ خواہش ساری دنیا والوں کی ہوگی کہ ان کا مذہب ساری دنیا میں پھیل جائے!!

اس نے کار روک دی اور نہ چاہتے ہوئے بھی تقریر سننے کے لئے کار سے اتر گیا۔ وہ اس وحشت، حیوانیت اور درندگی کے عالم میں امن کا پیغام سننا چاہتا تھا، محبت کا نام سننا چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کے مذہبی پیشوا محبت اور پیار کا پیغام دے رہے ہوں گے۔ امن اور شانتی کے لئے لوگوں کو پکار رہے ہوں گے۔

وہ آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کئی سو تلواریں، چھرے اور بھالے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا یہ لوگ اپنے گھر سے غلط کام کے ارادہ سے نکلے ہوں گے لیکن اپنے دھرم کے رہنما سے امن کا پیغام سن کر ان کا ارادہ بدل گیا۔ انھوں نے اپنے بھالے، چھرے اور تلواریں پھینک دیں۔ اس کا سر اپنے رہنما کے سامنے

عقیدت سے جھک گیا۔

اسٹیج پر تقریر ہو رہی تھی۔ لوگوں میں جوش و خروش ابھر رہا تھا۔ اس کے دل کی کیفیت بھی بدلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں صرف پیشوا کے الفاظ گونج رہے تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے مسلمانوں کی طرح احمد بھی اس کا دشمن ہے۔ احمد چاہتا ہے اس کا مذہب ختم ہو جائے۔ احمد چاہتا ہے اس کی تہذیب مٹ جائے، اس کا تمدن تباہ ہو جائے ——— احمد ایک بار اس کے وطن کا بٹوارہ کروا چکا ہے۔ اب دوبارہ اس کے وطن کو تقسیم کر دینا چاہتا ہے ——— احمد اس کا دشمن ہے، اسی کا نہیں، اس کے وطن کا، اس کے مذہب کا، اس کی تہذیب کا، اس کی زبان کا ——— احمد اس کا، اس کی نسل کا دشمن ہے !!

تقریر ختم ہو گئی ——— لوگ کھڑے ہو گئے، ان کے قدم آگے بڑھے۔ ایک گرجدار آواز فضا میں گونجی ——— "بہادرو آگے بڑھو ——— اپنے دشمن سے بدلہ لے لو ——— بہادرو آگے بڑھو !!"

اس نے دیکھا لوگ تلواریں، بھالے اور چھرے اٹھا رہے ہیں اور اس نے بھی ایک چھرا اٹھا لیا۔

کار تیزی سے اپنی منزل کی طرف جا رہی ہے ———

منزل آ گئی۔ وہ کار سے باہر آیا اور بند دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا ——— آواز آئی "کون ؟"

"احمد ! میں ہوں پرکاش !!"

"اوہ تم !" یہ کہتے ہوئے کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر چلا گیا اور

احمد دروازہ بند کرنے لگا لیکن احمد کے دروازہ بند کرنے سے پہلے پرکاش کا چھرا اپنا کام کر چکا تھا۔ احمد ڈگمگایا اور گر پڑا۔ اس کے لب ہلے لیکن آواز نہیں سنائی دی شاید وہ کہہ رہا تھا ——

"اچھا ہوا تم نے اپنا خون واپس لے لیا ورنہ سدا میرے اوپر ایک احسان رہتا!!"
وہ آگے بڑھا۔ تنویر اپنے کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ بھابی باورچی خانہ میں کچھ کام کر رہی تھیں۔ اچانک تنویر چیخا۔ امی! امی!!" ماں دوڑتی ہوئی باورچی خانہ سے باہر نکل آئی۔ اس نے دیکھا پرکاش اپنا چھرا تنویر کے سینے سے باہر نکال رہا ہے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے آنکھ کھولنے سے پہلے پرکاش کے چھرے نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔

پرکاش آگے بڑھا۔ روحی سہمی ہوئی، ڈری ہوئی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا چچا نے ابا کو مار ڈالا، تنویر اور امی کو بھی ختم کر دیا۔ اب وہ اسے بھی مار ڈالیں گے۔ ایک بار چھری سے اس کی انگلی کٹ گئی تھی تو اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی۔ تو کیا وہ اتنے بڑے چھرے کا وار برداشت کر سکے گی؟ اُف وہ مر جائے گی ——!!

پرکاش چھرا لئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ کانپی اور پوری طاقت سے پرکاش سے لپٹ گئی —— "چچا، مجھے مار ڈالئے گا؟ پرکاش چچا، چچا، میری جان بھی لے لیجئے گا؟؟"

پرکاش کے کانوں میں صرف ایک لفظ گونج رہا ہے "چچا! "چچا!! اور وہ سکتے کے عالم میں کھڑا ہے —— روحی روئے جا رہی ہے! فریاد کئے جا رہی

ہے !!
پرکاش نے پھر اچھینک دیا اور روحی کو گود میں اٹھالیا۔ روحی اس سے چمٹ گئی۔ کتنی بار جب اماں ابا اس پر خفا ہوئے تھے تب اسی گود نے اسے پناہ دی تھی اور آج پھر وہ اسی گود کی پناہ میں ہے۔ وہ روئے جارہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پرکاش بھی رو رہا ہے۔

"امی! لوگ ہر وقت رضیہ باجی کی برائی کیوں کرتے رہتے ہیں؟" میں
جب شادی سے لوٹی تو امی سے پوچھ ہی بیٹھی۔

"بیٹی اس نے بات ہی ایسی کی ہے۔"

"کون سی بات"

"پاگل ہوئی ہے؟ کہیں شریف لڑکیاں بھی ایسا کرتی ہیں؟"

امی یہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں لیکن میں ویسے ہی خاموش کھڑی رہی۔

رضیہ باجی کالج میں ہم لوگوں کو ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ سانولا رنگ، دبلا
جسم، لمبا قد سدا پھیکی پھیکی سوتی ساری میں لپٹا رہتا۔ عمر بھی کم نہ تھی لیکن شادی
ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ ان کے چہرے کپڑے اور انداز سب ہی سے پھیکا
پن ظاہر ہوتا۔ ہماری کلاس کی ساری لڑکیوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا کہ ان
کا کلاس سب سے بد کلاس ہے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک مشہور وکیل کی لڑکی ہیں۔ دولت مند

ہونے کے ساتھ وکیل صاحب کچھ دیوانے بھی مشہور ہیں۔

جب ان کے ابا کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا کیوں کہ ہمارے شہر میں کمسن لڑکیوں کی شادی کا عام رواج ہے اور رضیہ باجی تو اب جوانی کی حد کو پھلانگنے والی تھیں۔ میرا خیال اس وقت تک یہی تھا کہ لڑکی کی شادی صرف دولت کی کمی کے باعث نہیں ہوتی۔

میں نے ایک دن ان کے دوست سے ان کی شادی کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ رضیہ باجی کی امی ایک یوروپین تھیں اور کوئی مسلمان اپنی قومیت کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

رضیہ باجی کے ساتھ پہلی بار مجھے اس وقت ہمدردی کا احساس ہوا ایک دن میں ان کے یہاں یونہی گئی اور انھیں پورے گھر میں تنہا پایا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ابا رات گئے تک باہر رہتے ہیں اور مجھے کالج کے بعد سارا وقت یہاں تنہا کاٹنا پڑتا ہے۔ مجھے خود تنہائی سے خوف آتا ہے۔ میرا دل اس وقت ان کے لیئے بری طرح تڑپا اور میں نے دعا کی، اللہ، ان کی تنہائی کو جلد دور کر دے!!

میں نے نہیں سمجھا تھا کہ میری دعا خدا اتنی جلد سن لے گا۔ کچھ ہی ہفتہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے شرما نامی ہندو لڑکے سے شادی کر لی ہے۔

میرا شہر ایک چھوٹا سا شہر ہے اس لیئے وہاں ہر بات بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ تقریباً سارے لوگوں نے سر پیٹ لیا۔ لیکن کچھ لوگ میری طرح دیوانے بھی تھے جنہوں نے ان کا ساتھ دیا کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کیوں کہ کوئی مسلمان اپنی قومیت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا اور ہر عورت اپنا گھر

بسانا چاہتی ہے۔

شادی کے بعد رضیہ باجی نے کالج آنا بالکل چھوڑ دیا کیوں کہ بری طرح بیمار تھیں۔ پانچ چھ مہینے بیت گئے۔ ایک دن میں نے کالج میں سنا کہ وہ آئی تھیں۔ وہ پاگل ہو گئی ہیں۔ پرنسپل نے انہیں کالج سے نکال دیا

اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے شوہر کی پہلی شادی ہو چکی تھی اور ان کے تین بچے بھی ہیں۔ رضیہ باجی کو یہ معلوم نہ تھا اور جب یہ معلوم ہوا تو اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکیں۔ دیوانگی کے عالم میں وہ کہتی ہیں ـــ "میں قاتل ہوں! میں نے ایک عورت کی خوشیوں کو کچل ڈالا! میں نے تین معصوم بچوں کو تباہ کر ڈالا!!"

مجھے پہلی بار ان کی غفلت کا احساس ہوا لیکن میری بھابی نے کہا عورت کا رشک وحسد مشہور ہے۔ وہ ایک سوکن کو برداشت نہ کر سکیں۔ اور لوگوں نے کہا خدا کا قہر نازل ہوا ہے، "جیسی کرنی ویسی بھرنی!"

کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ اب وہ صحت یاب ہو گئی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بہت جلد ماں بننے والی ہیں۔ مجھے اس خبر سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ مجھے خوف تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟؟

پھر میں نے سنا کہ ان کی زندگی کے چمن میں ایک خوبصورت سی کلی کھلی ہے۔ میں اسے بہت شوق سے دیکھنے گئی۔ وہ بالکل سرخ سویرا تھی۔ کیوں کہ لوگوں کا بیان ہے کہ جب سرخ سویرا آئے گا تو ساری فضا ہنس پڑے گی۔ ہر طرف مسرتیں پھیل جائیں گی۔ اور رضیہ باجی کا سونا گھر اس وقت پوری

طرح زندگی سے ہم کنار تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد یہ خبر بھی اخبار میں آ گئی کہ وکیل صاحب کی لڑکی نے اپنی بیٹی کا گلا گھونٹ دیا!!

اس کے دوسرے دن میں ان سے ملنے گئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ، ہاں، میں نے اپنی بیٹی کو اس لئے مار ڈالا کہ اس کا بھی مجھ جیسا حشر نہ ہو!! ــــ کیا تم بھی مجھے قاتل کہو گی؟؟

صبح کا بھولا

منا جا ءِ نماز پر بیٹھا ہے۔ اس کا ہاتھ دعا کے لئے اٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہا ہے۔ لیکن میرے لبوں پر ہنسی کھیل رہی ہے۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے کہ یہ کیسی ماں ہے کہ بچہ رو رہا ہے اور یہ ہنس رہی ہے لیکن کون ماں ایسی ہوگی کہ جس کا بیٹا غلط راستے سے لوٹ آئے اور وہ خوشی نہ منائے گی۔ کل تک یہی منا اپنی غلط حرکتوں پر خوشیاں مناتا تھا اور آج وہی منا اپنے گناہ پر پچھتا رہا ہے، رو رہا ہے!

منا کی عمر گیارہ بارہ سال ہے لیکن بلا کا ذہین ہے۔ چار سال کی عمر میں میں نے اسے مدرسہ میں بیٹھا دیا۔ مولوی صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ یہ اپنا سبق پابندی سے یاد کرتا اور ساتھ ساتھ گھر کا کام بھی کرتا، میں بھی خوش تھی۔ آٹھواں سال آتے آتے اس نے نماز سیکھ لی اور پابندی کے ساتھ پڑھنے لگا۔

لیکن ایک دن ایک نئی بات ہوئی۔ میری صندوقچی سے کسی نے دو روپیہ نکال لیا تھا۔ گھر میں میرے اور منا کے سوا کوئی نہیں ہے، منا پر مجھے شک ہو

ہی نہیں سکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ میں حساب بھول رہی ہوں لیکن دو تین دن بعد دوبارہ روپیہ غائب تھا۔ میں نے منا سے پوچھا، اس نے انکار کیا اور رونے لگا۔ میں اسے بہت چاہتی ہوں۔ منا کے سوا میرا کون ہے؟ منا کے ابا نے دوسری شادی کر لی ہے اور اپنی نئی دلہن کے ساتھ دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ اور منا کا بھی میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں اسے ذرا پریشان نہیں دیکھ سکتی۔

جب اس نے روپیہ لینے سے انکار کیا اور رونے لگا تب میں اسے لپٹا کر پیار کرنے لگی اور بہلانے لگی۔ منا ہنسنے لگا، میں بھی ہنس دی۔

اب روز روز روپیہ صندوقچی سے غائب ہونے لگا۔

میرا شک روز بہ روز منا پر پختہ ہوتا گیا۔ ویسے میں اس سے جب بھی پوچھتی وہ انکار کرتا، جب میں سختی کرتی وہ رونے لگتا اور میں ہار جاتی۔ میرے ہاتھ جو اسے مارنے کے لئے اٹھتے تھے۔ وہ اس کے گلے میں چلے جاتے اور وہ میرے سینے سے لگ جاتا۔ میں مامتا سے مجبور تھی۔ اس کی چنچل آنکھوں میں جب میں خوف وہراس پاتی تو تڑپ اٹھتی۔ اس کے گلابی گال جب ڈر سے نیلے ہو جاتے تب میں کانپ جاتی اور اسے کچھ کہے بغیر سینے سے لگا لیتی۔ میرا پیار اس کے حق میں زہر بن رہا تھا، اس کا مجھے یقین تھا لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میں تنہائی میں اس کے مستقبل کا خیال کر کے بہت روتی لیکن میرے آنسو اسے کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے؟ میں نے اسے کہانیوں کے ذریعہ راہ راست پر لانا چاہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پیسے غائب ہوتے رہے اور وہ انکار کرتا رہا۔ اب اس نے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میرے خیال میں کل بہت بڑی بات ہو گئی۔ میں جب کمرے میں گئی تو دیکھا کہ منا امرود کھا رہا ہے۔ میں نے امرود خریدا نہیں تھا۔ میرے یہاں امرود کا پیڑ نہیں ہے۔ یہ امرود اس نے کہاں سے لایا؟ میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے پڑوس کے باغ سے امرود چرایا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں غصہ سے کانپ گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج اسے کوئی بہت سخت سزا دونگی۔

مجھے اچانک دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ رونے لگا لیکن آج میرے ارادہ کو کوئی بھی نہیں ڈگمگا سکتا تھا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ اس سے اقرار کرا کر رہوں گی۔ شروع میں وہ خاموش رو رہا تھا لیکن جب میں نے مارنا شروع کیا تب اس نے اقرار کر لیا کہ پڑوس کے یہاں سے چرا کر لایا ہے۔ میں نے اس سے کہا ،، بیٹا! کتنی خراب بات ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ کتنی ذلت ہو گی اور تمہیں سزا الگ ملے گی ،،۔

اس نے جواب دیا ،، اماں! وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی رہتا تو میں توڑتا ہی نہیں۔ جب کوئی نہیں دیکھے گا تو پھر مجھے سزا کیسے ملے گی،، میں نے اسے سمجھایا ،، تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ اگر کوئی آدمی نہیں دیکھے گا تو کیا؟ ایک ہستی تمہاری اس حرکت کو دیکھ رہی ہو گی ،، اس نے پوچھا ،، کون ،،

میں نے کہا ،، کیا نہیں جانتے ہو کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ہم لوگوں کی ہر بات دیکھتا ہے اور غلط کام کے لئے ہمیں سزا دیتا ہے ،،۔

اس کا جواب تیار تھا ،، اماں خدا کہاں ہے؟ خدا کہیں نہیں ہے۔ جب خدا نہیں ہے تب وہ ہمارے کام کو کیسے دیکھے گا؟ ،، اماں! خدا کا وجود نہیں ہے ،،

اس نے بہت ہی اعتماد کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا لیکن مجھے سکتہ لگ گیا۔ ایسا لگا کہ ساری زندگی کی محنت برباد ہو گئی۔ صرف ایک خیال تھا کہ خدا کو کیا جواب دوں گی، جب وہ پوچھے گا تو نے کیسی تعلیم و تربیت اپنے لال کو دی تھی۔

میں نے غصہ سے کہا، کیسی باتیں کرتے ہو؟ خدا ہے ۔۔۔ نہیں ہوتا تو انسان پیدا کیسے ہوتا؟ مرتا کیسے؟ زندگی اور موت کس کے ہاتھ میں ہے؟؟

اس نے جواب دیا، "زندگی اور موت ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھئے ما، مجھے اور رامو دونوں کو کالرا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا علاج کیا اور میں اچھا ہو گیا لیکن رامو غریب تھا، اس کا علاج نہیں ہو سکا اور وہ مر گیا۔"

میں نے سمجھانا چاہا "دیکھو ایسی باتیں نہیں کرتے، خدا بری باتوں کے لئے سزا دیتا ہے ۔۔۔"

اس نے مجھے سمجھایا "اماں! آپ کہتی ہیں کہ رشوت لینا، چوری کرنا، دغا دینا بری بات ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سامنے مکان میں جو مجید چچا رہتے ہیں، وہ رشوت، چور اور دغا بازی کے لئے مشہور ہیں لیکن خدا نے ان کو کیا سزا دی؟ دیکھئے ان کا کتنا بڑا مکان ہے، کار ہے، ریڈیو ہے۔ آرام کی ساری چیزیں ہیں ۔۔۔ اگر خدا ہوتا تو انہیں ان کے برے کام کے لئے سزا دیتا۔

اس کی ذہانت غلط راستے پر لگ چکی تھی اور میں ایک ایسے جواری کی طرح جو جوئے میں سب کچھ ہار چکا ہے خاموش کھڑی سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کہا۔ "خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ اچھے اور برے کام کا بدلہ ضرور دیتا ہے۔ ہاں اس کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔ خدا کا

وجود ہے اور ضرور ہے کیوں کہ اتنی بڑی دنیا بغیر کسی خالق اور منتظم کے کیسے چل سکتی ہے۔"

"اماں! جب وقت آئے گا تو میں دیکھ لوں گا"، وہ یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ پھر کیا ہوا؟ مجھے کچھ نہیں یاد ہے۔ میرے ہوش و حواس اڑ چکے تھے۔ مجھے صرف اس کی فکر تھی۔ اس کے انجام کا خیال تھا۔

اسی بے خیالی میں میں نے روپیہ طاق پر رکھ دیا۔ منّا نے شاید مجھے روپیہ رکھتے دیکھ لیا تھا۔ آج صبح میں اس نے روپیوں کو غائب کر دینا چاہا۔ اس ارادہ سے اس نے طاق پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ کسی کیڑے نے اسے کاٹ لیا۔ مجھے ایک چیخ سنائی دی، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میں نے دیکھا کہ منّا مجھ سے لپٹ کر رو رہا ہے، "اماں مجھے معاف کر دیجئے! خدا ہے، اماں خدا ہے!! دیکھئے نا، اس نے مجھے برے کام کے لئے سزا دیدی۔ میں نے ہر دن کی طرح آج بھی آپ کا روپیہ غائب کرنا چاہا تو ایک کیڑے نے مجھے ڈنک مار دیا۔ دیکھئے خون بہہ رہا ہے۔ آپ نے صحیح کہا تھا کہ خدا کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ــــ اور اس کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔"

وہ اتنی ساری باتیں کہتا چلا گیا لیکن میں خاموش کھڑی رہی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اتنی بڑی خوشی سہہ نہ پاؤں گی کہ میرا بیٹا میرا چاند غلط راہوں سے لوٹ آیا ہے ــــ میں اس وقت چونکی جب اس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ "کچھ بولئے!!"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ آج پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تھا لیکن یہ آنسو سچائی اور خلوص کا تھا۔ اس کے گال خدا کے خوف سے نیلے ضرور ہو رہے تھے لیکن ان میں حق کا نور بھی پوشیدہ تھا۔

میں نے اُسے سینے سے لگالیا اور کہا، بیٹا! خدا سے معافی مانگو۔"

اور وہ خدا کے دربار میں اپنے گناہوں سے توبہ کر رہا ہے ۔۔۔۔۔

دو تصویریں

شام کا وقت تھا۔ روحی کھڑکی میں کھڑی چمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ ان بچوں میں وہ اتنی محو تھی کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ شازی اس کے پاس کھڑا ہے۔

شازی نے اسے مخاطب کیا "بھابی"! آج کی رات مچل مچل جائے گی۔ دیکھئے بھیا آپ کے لئے پھول چن رہے ہیں۔" روحی نے پھولوں کی طرف دیکھا۔ راشد اپنے رومال میں بیلے کی کلیاں جمع کر رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ راشد ان پھولوں کا کیا کریں گے۔ وہ اس کے لئے بغیر اس کی فرمائش کے شاید ہی کوئی چیز لائے ہوں۔ وہ کیا سمجھیں گے کہ عورت کے لئے پھول، خوشبو رنگ، مہندی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ کاش وہ اس کے جذبات سمجھتے تو آج وہ اس دھیمی دھیمی آگ میں نہیں جلتی!۔

شازی نے اس کے خیالات کا سلسلہ پھر توڑ دیا۔ "بندہ چلا، وہ آرہے ہیں۔ اگر دو چار پھول بچ جائیں تو ادھر عنایت کر دیجئے گا۔!

"ایسی قسمت کہاں" روحی کے منہ سے نکل گیا۔

لیکن شازی ہنستا ہوا چلا گیا۔ روحی کی زندگی میں کبھی یہ دن نہ آیا تھا۔ کہ کسی نے خود سے اسے پھول لاکر دیا ہو۔ حالانکہ شادی کو تین سال ہونے کو آئے وہ اس امید کے ساتھ راشد کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آئیں گے اور ساری کلیاں اس کے بالوں میں سما دیں گے۔ اور۔ لیکن بہت دیر ہوگئی اور راشد نہ آیا۔ وہ انتظار کی تاریکی سے گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ سب لوگ اماں کے کمرے میں تھے۔ وہ بھی اماں کے پاس چلی گئی۔ راشد کا رومال راشد کے ہاتھ میں تھا اور کلیاں ماں کے سرہانے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے شاکی نظروں سے راشد کو دیکھا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ اپنے کمرے کی طرف مڑی۔ دروازے پر شازی کھڑا تھا۔ وہ بہت شرمندہ معلوم ہورہا تھا۔ روحی نے ایک نظر شازی پر ڈالی۔ اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ صرف آس ہی نہیں ٹوٹی تھی۔ دل بھی ٹوٹا تھا عورت اپنی انا اور ان کے تحفظ کے لئے سارے زمانے کی چوٹ سہہ سکتی ہے۔ لیکن آج وہ شازی کے سامنے بری طرح ذلیل ہوئی تھی۔

شام ہوگئی لیکن اس نے کمرے میں روشنی نہ کی۔ یکایک کسی نے پورے کمرے کو روشن کر دیا۔ وہ سمجھی راشد ہے لیکن شازی تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ شازی اس کا مذاق اڑانے آیا ہے۔ لیکن شازی کچھ نہ بولا۔ اس نے صرف اپنی ہتھیلی بڑھادی۔ جس پر بیلے کے کئی پھول ہنس رہے تھے۔ اس نے شازی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا نیا جذبہ تھا۔ جس سے وہ ناآشنا

تھی۔ بہت پرسکون معلوم ہو رہی تھیں اس کی آنکھیں۔ اس نے چاہا کہ پھول لے لیں کہ اچانک اسے اپنی امی کا جملہ یاد آ گیا۔ "پھول، عطر، سہرا، مہندی، چوڑی، سہاگ کی نشانیاں ہیں۔ پھر وہ سہاگ کی نشانی غیر سے کیوں لیتی۔ اس نے مسکرا کر شازی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بہت خوبصورت ہیں یہ پھول" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ شازی راشد کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس کے والدین دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ وہ یہاں ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔ جب تک اسے اپنا کوارٹر نہ ملے گا وہ یہیں رہے گا۔ شریر اور شوخ شازی میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو روحی کو متاثر کرتی۔ لیکن خود شازی اس سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔

" اوہ! یہ پڈنگ کس نے بنائی ہے"۔ شازی نے پڈنگ کھاتے ہوئے پوچھا۔ راشد نے سوال کیا۔ "کیوں"؟

بہت مزیدار ہے"۔!

"کیوں بناتے ہو" اس نے کہا۔

" اوہ! آپ نے بنایا ہے۔ کس سے سیکھا ہے آپ نے کھانا پکانا۔ کل کباب بنائے تھے۔ وہ بھی ایسے ہی لذیذ تھے۔ اور اس پڈنگ کا کہنا ہی کیا!

روحی نے شازی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت شوق سے پڈنگ کھا رہا تھا اس کے کسی انداز سے مبالغہ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ روحی حیرت میں ڈوب گئی۔ سوچنے لگی کہ اس گھر میں کسی کو بھی اس کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں ہے اور شاید راشد کو بھی نہیں۔ اگر انھیں پسند ہوتا تو ضرور کہتے۔

گیارہ بجے اور راشد اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ تھک گیا تھا۔ بستر پر جاتے ہی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن روحی نے اسے چھیڑا، بڈنگ کیسی تھی، "شازی کو بہت پسند آئی"۔

میں شازی کے بارے میں نہیں۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ چپ کیوں ہو؟ بولونا! "نیند آرہی ہے۔ تم بھی تھک گئی ہوگی"۔ سوجاؤ۔

راشد سو گیا۔ لیکن روحی جاگتی رہی۔ راشد اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے کبھی اسے کوئی جسمانی اذیت نہ دی۔ لیکن جسمانی اذیت کا علاج ہے۔ اور روحانی تکلیف کا کوئی مداوا نہیں۔ روحی کو آج بھی وہ وہ رات یاد ہے جسے دنیا سہاگ رات عورت کی زندگی کی سب سے حسین رات کہتی ہے۔ لیکن وہ آج تک نہ سمجھ سکی کہ اس رات کو سب سے حسین رات کیوں کہا جاتا ہے۔ اسے تو وہ رات بہت کربناک معلوم ہوئی۔ وہ دلہن بنی ہوئی۔ پھولوں اور زیورات سے لدی ہوئی منتظر تھی کہ راشد آگے بڑھ کر سہارا دے گا۔ پیار کا سہارا۔ اس سے پیار و محبت کی باتیں کرے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ کیسی ہے؟ لیکن کچھ نہ ہوا، وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اور ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ راشد سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اتنی بے اعتنائی برتو گے تو جیون کی لمبی ڈگر کیسے پار ہوگی۔؟

راشد نے اسے دیکھا اور شاید اس کی آنکھوں میں اس کا درد پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ بڑھے۔ لیکن عورت کی نسائیت پھر جاگ اٹھی۔ شرم وحیا ناز و ادا سے اس کی پلکیں جھک گئیں اور اس نے منہ موڑ لیا۔ وہ منتظر

تھی کہ راشد آگے بڑھے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں۔ راشد کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسکی طرف خود کوئی نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے پاس کوئی ایسی ادا نہیں جو کسی کو بھا سکے۔ مدوجزر خود چاند کی طرف کھینچتا ہے۔ چاند کبھی مدوجزر کی طرف نہیں بڑھا۔ اور وہ راشد کے قدموں میں گر گئی۔ لیکن دل پر بہت چوٹ لگی۔ اتنی گہری کہ وہ زخم آج تک مندمل نہ ہوسکا۔

انھیں خیالوں میں الجھی الجھی روحی سو گئی۔ کئی دن گذر گئے شازی اسکی طرف بڑھتا ہی آیا۔ اب تو کبھی کبھی وہ اس کے خیالوں میں بھی آجاتا۔ ایک چنچل اور زندہ دل انسان کے روپ میں۔ ایک مہربان کے روپ میں۔

شام کی ٹرین سے راشد کو اپنے کام پر واپس جانا تھا۔ وہ سارا دن اداس رہی۔ راشد بھی سوگوار تھا۔ روحی کا دل بہت شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ راشد کے ساتھ جائے۔ لیکن یہی اس خواہش کا اظہار بھی اب وہ زبان سے نہیں کر سکتی۔ شروع شروع میں اس نے زور ڈالا کہ وہ اپنے گھر جائے گی۔ لیکن راشد کے پاس ہزاروں مجبوریاں تھیں۔ اور راشد کی مجبوریوں نے اسے بھی مجبور کر دیا۔ شاید وہ اس لائق نہیں تھی کہ کسی کا گھر آباد کر سکے۔ اس گھر میں اپنے سسرال میں بھی وہ اجنبی ہی کی طرح تھی۔ وہ یہاں اس طرح رہتی جس طرح ایک مہمان رہتا ہے۔

وہ راشد کا سامان ٹھیک کر رہی تھی کہ شازی نے اسے پکارا "کیسی ہیں"؟ اس نے نظر اٹھا کر شازی کو دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اوہ" آنکھ بالکل لال ہو رہی ہے۔ وہ بھی اداس ہیں۔ آپ ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں۔ ہو سکتا ہے یہاں آپ کو زیادہ آرام ہو۔ لیکن سنا ہے دو چاہنے والے جنگل میں بھی چلے جائیں تو وہ جنت بن جائے۔"

روحی نے پھر شازی کی طرف دیکھا وہ شازی سے کیسے کہتی کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ کسی کا گھر آباد کر سکے۔ اور رہی عورت کی جنت کی بات تو یہ وہی جگہ ہے جہاں اس کا سرتاج رہتا ہے۔ اسی لئے سیتا نے رام کے ساتھ جنگل کی راہ لی تھی۔

راشد کسی کام سے کمرے میں آیا۔ شازی اسی سے کہنے لگا۔ بھیّا! بھابی کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیے۔ عورت کے بغیر گھر سونا ہوگا۔ "ہاں یہ بات ہے لیکن یہاں اماں، ابا اکیلے ہو جائیں گے اور انھیں تکلیف بھی ہوگی۔" راشد نے جواب دیا۔

وہ غم و غصہ سے تڑپ کر رہ گئی۔ راشد کو اس کی محبت پر یقین کیوں نہیں ہے۔ راشد چلا گیا۔ روحی کی زندگی کی تنہائیاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ کنوارپنے کے لمحات تنہا آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد یہ تنہائی پہاڑ بن جاتی ہے۔

شاید شازی کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے اور راشد کے درمیان دیوار ہے اور اس دیوار کو گرانے کے بجائے اسے کچھ اور اونچی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجبوراً روحی شازی سے کترانے لگی۔ کیونکہ شازی کے دل میں کوئی چور دروازہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ شازی کو کیسے سمجھاتی کہ عورت اپنے سہاگ

کے بارے میں بہت مخلص ہوتی ہے۔ اپنے جانتے اپنے سہاگ دیوتا کو کبھی دھوکہ نہیں دیتی۔ اور راشد تو اس کا پہلا پیار بھی ہے۔

ایک دن غضب ہوگیا۔ اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ سرخ کرتا، سرخ دوپٹہ اور سرخ چوڑی دار پاجامہ۔ شازی نے دیکھا اور دیکھتے ہی بولا۔ "کلی کو پھول بنتے سنا اور دیکھا تھا۔ لیکن آج پھول کو کلی بنتے دیکھ لیا۔" روحی بل کھاکر رہ گئی۔ شازی کو اس سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مجال ہے۔ غصہ میں وہ کمرے سے باہر آگئی۔ لیکن بار بار اس کا دل آئینہ کے سامنے جانے کو بھی چاہ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ آج تک کسی نے اس کی تعریف نہیں کی۔ یہاں تک کہ راشد نے بھی اس کے حسن، اس کے روپ کے بارے میں اس والہانہ انداز سے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔

ساری رات وہ سو نہ سکی۔ شازی کی باتیں ایک طرف اسے تروس کررہی تھیں۔ دوسری طرف شازی کا خلوص اس کا والہانہ پیار اس کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا رہا تھا۔

شازی نے (۳۱) کے دل کا چور دروازہ دیکھ لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ اسے کھول نہ دے۔ ساری رات راشد اسے یاد آتا رہا۔ اس نے اسے اسی وقت خط لکھا کہ وہ اسے اپنے پاس بلالے یا اس کے پاس آجائے لیکن وہ خود آیا نہ اسے بلایا۔

اب روحی حالات سے مجبور تھی۔ اور شازی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ آخر خدا نے اس کی مشکل آسان کردی۔

شازی کو کوارٹر مل گیا اور وہ چلا گیا۔

ایک دن شازی آیا تو اماں کی جان کو لگ گیا۔ کہ مجھے گھر کی آرائش کے لئے کچھ سامان خریدنا ہے۔ اس معاملے میں عورت کی رائے بہتر ہوتی ہے۔ اس لئے بھابی کو ساتھ جانے دیجیئے۔ اماں نے اجازت دیدی۔ روحی بھی خوش تھی۔ گھر بسانے اور سجانے کا شوق اسے بچپن سے ہی تھا۔

شازی نے سارے روپے روحی کے ہاتھ میں دیدیئے اور اس نے گھر سجانے کیلئے سارا سامان اپنی پسند سے خریدا، وہ بہت خوش تھی۔ لیکن بعد میں اسے بہت بڑی ٹھوکر لگی۔ جب وہ گھر لوٹنے لگی تو شازی نے کہا بھابی مرا دل چاہتا ہے۔ آپ اپنے وجود سے اس گھر میں رونق بخشئے۔ یہ کہتے ہوئے خود شازی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اور روحی تو دم بخود رہ گئی۔ اسے یہ توقع نہ تھی کہ شازی اتنا گر سکتا ہے۔

وہ بولی "شازی میں فلرٹ نہیں ہوں"۔

"جی مجھے معلوم ہے لیکن ایک قیدی ضرور ہیں۔ ایک قیدی اور بے گناہ قیدی کو آزاد کرانا ہر شخص کا فرض ہے"۔

وہ غصہ میں تنہا ہی واپس آگئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ شازی سے کبھی بات نہ کرے گی۔ لیکن شازی نے اس کے دل کا چور دروازہ کھول دیا تھا۔ بار بار اس کے کان میں "قیدی اور بے گناہ قیدی" کا لفظ گونجتا رہا۔ حقیقت میں وہ قیدی تھی۔ پیار کی زنجیر دل میں نہیں بے اعتنائی

اور بے پروائی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قیدی۔ !

شازی اب بھی آتا۔ لیکن روحی اس کے سامنے نہ جاتی۔ کچھ دن اس نے خاموشی سے گزارے۔ اور پھر خطوں کی بھرمار کر دی۔ ہر خط میں اس کے لئے نئی زندگی کی راہ پیش کی گئی تھی۔ اس کے لئے وہ ساری دنیا کو ٹھکرانے اور سارے جہاں سے لڑنے کے لئے تیار تھا۔ وہ لکھتا میرے گھر کا دروازہ ہمیشہ تمہارے لئے کھلا رہے گا۔ جب بھی میری ضرورت محسوس کرو فون کر دینا میں لینے آؤں گا۔ اور روحی ان خطوں کا جواب شازی کے سامنے ان خطوں کو جلا کر دیتی۔

لیکن یہ سب کچھ دن کی روشنی میں ہوتا۔ رات کی تاریکی میں راشد کے ساتھ شازی کا خیال بھی اس کے تصور میں آجاتا۔ راشد کو وہ خود پیار کرتی تھی اور شازی اس کا دیوانہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے اعتنائی نے شازی کو نڈھال کر دیا ہے۔ وہ بہت افسردہ نظر آتا ہے۔ چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی ہے۔ عورت اپنی جان سے زیادہ اپنے محبوب کا خیال رکھتی ہے

ہاں کبھی کبھی وہ سوچتی عورت اسی کی ہے جیسے اس کی ضرورت ہے۔ ساری ساری رات اس کے دل و دماغ میں جنگ ہوتی رہتی۔ دل تو راشد کا تھا۔ دماغ جو شازی کا سہارا لے کر خوشیوں کو اپنا لینا چاہتا تھا۔

اسی کشمکش کے باعث وہ بخار میں جل اٹھی۔ اس دوران راشد آگیا۔ اسے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اپنے سامنے دوا دلواتا۔ پرہیز کرنے کیلئے تاکید کرتا۔ لیکن زیادہ تر اس سے دور ہی رہتا۔ دل کی آگ اس کی دوری سے اور

بھڑک اٹھی اور وہ جل کر خاک ہو گیا۔ دماغ دل سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ وہ فیصلہ دل پر ڈال دینا چاہتا تھا۔

شازی پابندی کے ساتھ اسے دیکھنے آتا۔ گھنٹوں اسی کے پاس بیٹھتا۔ اور بار بار فون کرتا۔ ہاں جاتے وقت فیصلہ سننے کی خواہش ضرور کرتا۔ اور ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا۔ دماغ کی جیت ہو گئی۔ اسی دن اسے بخار سے نجات ملی تھی۔ سب لوگ کہیں جا رہے تھے۔ روحی نے کمزوری کے باعث جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور راشد کو بھی روک رہی تھی۔ لیکن راشد کا کہنا تھا کہ ابا اماں کے سامنے وہ مجبور ہے۔ اس نے بہت کہا لیکن راشد جھٹک ہی گیا۔ اور وہ غصہ میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ وہ اٹھی اور شازی کا فون نمبر ملایا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ "مجھے لینے آجاؤ!!" لیکن اس کی نظر سامنے کھڑکی کے باہر چلی گئی۔ راشد میدان میں کھڑا ابا کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی۔ جس نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ تو کیا وہ معصوم راشد کو دھوکہ دے گی۔ بھلا کسی پجارن نے اپنے دیوتا کی پوجا اس لئے چھوڑ دی ہے کہ اس کا دیوتا اس کی التجائیں نہیں سنتا۔ تو وہ راشد کو کیوں دھوکہ دے گی۔ ؟؟ راشد سے کیسے منہ موڑے گی۔ ؟؟

شازی پوچھ رہا تھا کون ہے ؟؟"

"میں ہوں روحی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے، پجارن کی جنت اسکے دیوتا کے قدموں تلے ہے۔ اور میرے دیوتا راشد ہیں.... یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔ اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے سامنے کبھی راشد کی تصویر ابھر جاتی اور کبھی شازی کی

* * ———

نئی راہ

کنول ــــ

القاب دیکھ کر تم چونک اٹھی ہوگی، میں نے بھی کیا لکھ دیا! پہلے تمہیں خط لکھتا تھا تو نہ جانے کیسے کیسے القاب لکھتا تھا۔ میری روح، میری کنول، میری زندگی، جیسے القاب لکھنے والا آج تمہیں صرف کنول ہی کہہ کر مخاطب کر رہا ہے!! ہے نہ حیرت کی بات! لیکن وقت کے کھیل عجیب ہی ہوتے ہیں۔

دیکھو، بگڑ مت بیٹھنا کہ پہیلی بجھا رہا ہوں۔ اس لئے کہ اب بگڑ دگی تو میں منا بھی نہ سکوں گا۔ اور جب تم مجھ سے ناراض رہو گی تو مجھ سے میری زندگی روٹھ جاتی ہے گی!

آج تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں اسے پڑھ کر تمہیں پہلے حیرت ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ پوری بات جان لینے کے بعد تمہیں خوشی ہوگی اس لئے کہ میں جانتا ہوں، تم جتنی خوبصورت ہو، تمہارا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہے

—— آؤ ذرا ماضی کے پردے کو سرکا کر پیچھے کی طرف دیکھیں۔

میرے ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں آرٹس لوں۔ انہیں شوق تھا میں ڈاکٹر یا انجینیر بنوں۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ میں آرٹس لینا چاہتا ہوں تو انہوں نے اپنے شوق کو دبا دیا۔ سنٹرل اسکول سے نکلنے کے بعد میں نے پٹنہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرے مضامین تاریخ، حساب اور فلسفہ تھے۔ ابا کا خیال تھا ان میں باہم کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ چاہتے تھے ہسٹری، پولٹکس اور اکنامکس لوں۔ لیکن خدا کی شان! میری اور ان کی پسند میں بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ جبر کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ میرے ذاتی معاملے تھے۔ مجھے اپنی زندگی خود بنانی تھی۔ ابا نے مجھے بچپن سے خودمختار بنا رکھا تھا۔ اماں کبھی کبھی ٹوک دیتیں لیکن ابا کبھی نہیں۔ ہاں وہ میری کسی شرارت پر کبھی معاف نہ کرتے۔ میری معمولی سی گستاخی پر سخت سزا دیتے، مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیتے۔

جب میں نے حساب میں آنرز لیا تم سے ملاقات ہوئی۔ پورے کلاس میں ہم تین ہی طالب علم تھے، تم راجن اور میں۔ ولایت لال سانولا سا راجن بہت ہی دوست نواز ثابت ہوا۔ ہم تینوں کا ساتھ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ہوتا لیکن راجن ہماری خاطر کرتے نہ تھکتا۔ ہم تینوں اچھے دوست بن گئے تھے۔ ہمارے سامنے مذہب کی دیوار تھی نہ عورت مرد کا سوال۔ ہم نے نہرو کے بھارت میں آنکھ کھولی تھی اور ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ ہم ہندوستانی ہیں!

ہماری دوستی پروان چڑھتی رہی لیکن کچھ ہی مہینہ بعد ہمیں ایک دھکا لگا۔ راجن کے پاپا کی بدلی ہو گئی اور وہ چلا گیا۔ ایک اچھے دوست کا کھونا شاید کسی قیمتی

جواہر کے کھو دینے سے کم نہیں ہے۔

اب صرف ہم دونوں ہی رہ گئے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے رہے لیکن ہمیں محسوس بھی نہ ہوا کہ ہم کن راہوں پر چل رہے ہیں؟ بی اے کے امتحان میں ہم دونوں کامیاب ہوئے۔ اب ایم۔اے میں ہر وقت کا ساتھ تھا۔ محبت بڑھتی ہی رہی لیکن مجھے احساس نہ ہوا کہ میرے دل نے تمہیں ساری زندگی کا ساتھی مان لیا ہے۔ میں تو سمجھتا دو انسانوں کا ساتھ ہوگا تو محبت اور پیار بھی ہوگا۔ میرے بہت سارے لڑکے اور لڑکیاں دوست تھے۔ مجھے ان سے پیار تھا۔ یہ پیار انسانیت کے ناطے سے تھا۔ یہ محبت ایک دوست کی دوسرے دوست کیلئے بھی۔

لیکن محبت بھی کبھی چھپی ہے۔ ایک دن میرے دل کا راز مجھ پر ظاہر ہو گیا۔ دو تین دن ہو گئے تم کالج نہیں آئی تھیں اور میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرا سارا قرار کسی نے چھین لیا ہے۔ ابا کو میری بیقراری کا احساس تھا۔ انہوں نے پوچھا بھی تم کیسے ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟ میں نے ان کے سوال کو باتوں میں ٹال دیا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو۔ میں نے کلاس چھوڑ کر تمہارے گھر کی راہ لی۔ لیکن تمہارے گھر کے دروازے سے لوٹ آیا۔ میرے دل نے مجھے عجیب عجیب طرح سے خوفزدہ کیا تھا۔ مجھے پہلی بار اپنے دل کے چور کا احساس ہوا۔ میں ساری رات اپنے دل کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ مجھے اس سے شکایت تھی کہ تمہاری توہین کر رہا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر تمہیں خبر ہو جائے تو میرے بارے میں کیا سوچو گی؟؟

میں اپنے دل کو سمجھاتا رہا لیکن دیوانہ دل میرا کہنا ماننے کو تیار نہ ہوا۔ آخر میں ہار گیا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں چپکے چپکے پوجتا رہوں گا۔ کبھی بھی زبان پر اپنے دل

کا راز نہ لاؤں گا۔

تم ابھی تک بیمار تھیں۔ میں ایک دن تمہیں دیکھنے چلا ہی گیا۔

تم بستر پر پڑی تھیں۔ مجھے وہیں بلوا لیا۔ جب مجھے دیکھا تو ہولے سے مسکرا دیں اور کہا "اب آئے ؟؟" یہ جملہ ہی نہیں، تمہارے سارے سراپا تمہارے دل کا راز کہہ رہا تھا۔

میں بھی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا اور ہمارے دل نے ہم آہنگ ہو کر سب کچھ ایک دوسرے سے کہہ دیا۔ فاصلے مٹ گئے، ہم ایک ہو گئے ——— ہم بھول گئے کہ ہمارے درمیان مذہب کی اونچی دیوار ہے جو دو دوستوں کے درمیان آئے یا نہ آئے لیکن دو دلوں کے درمیان ضرور آئے گی۔ ہم نے ساری زندگی ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو اپنا سمجھا۔ اب ہم ہر جگہ ساتھ رہنے لگے، ساتھ دیکھے جانے لگے۔ بات کب تک چھپتی، خدا کو کسی نے دیکھا ہے اندازہ ہی سے سمجھا ہے۔ ہمارے پیار کو بھی لوگ سمجھ گئے۔

پھر ہماری ایک ایک بات کے سو سو افسانے بننے لگے۔ بات ہمارے گھر تک پہنچی۔ تم نے بتایا کہ تمہارے بابو نے غصہ میں چھری تک نکال لی تھی لیکن تمہارے بھیا بیچ میں آ گئے۔ انھوں نے سمجھایا کہ کنول بڑی ہو گئی ہے۔ اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ خوشی سے تو نہیں لیکن تمہارے تیور دیکھ کر انھوں نے بھی تمہارے بھیا کا کہا مان لیا۔

میرے گھر کا انداز سدا سے نرالا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اماں کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو رہتے ہیں۔ مجھے سبب معلوم تھا۔ لیکن ابا کے ڈر سے وہ مجھے کچھ نہیں

کہہ رہی تھیں۔ ابا نے مجھے اجازت دے دی۔ انھوں نے کہا یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ تمہاری خوشی ہماری خوشی ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا اگر ابا نے میرے خوابوں کی تکمیل میں دیوار بننے کی کوشش کی تو ان کی پرواہ نہ کروں گا۔ وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ یہی نہ مجھے عاق کر دیں گے۔ مجھے اپنے بازو پر بھروسہ تھا، اپنے خدا پر بھروسہ تھا میں اپنی دنیا خود تعمیر کر سکتا تھا۔

لیکن ابا ہمارے درمیان دیوار نہ بنے۔ انھوں نے میرے خواب کے لئے اپنے خواب کو تار تار کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بچپن میں مجھے گود میں لے کر امی سے کہتے تھے، "میں ایسی چاند سی بہو لاؤں گا کہ سارا خاندان دیکھ کر رشک کر اٹھے گا!" لیکن آج سارا خاندان، سارے جلنے والے ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سب لوگ انہیں ذلت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ میرے لئے اس بے عزتی کو ہنستے ہوئے برداشت کر رہے ہیں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ لیکن کیا کروگی؟ ہمارا سماج ابھی تنگ نظر ہے کہ وہ سچے پیار اور خلوص کو نہیں پہچان سکتا۔

تمہارے بابو کو بھی ان سب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ انھوں نے بھی اپنے سپنوں کو اپنے پیروں سے کچلا ہوگا۔ تمہارے لئے اپنی خوشی کو تج دیا ہوگا۔

میں دیکھ رہا ہوں دن پر دن تمہارے بابو اور میرے ابا کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ دھیمے دھیمے وہ دونوں کسی آگ میں سلگ رہے ہیں۔

کنول! کیا یہ صحیح ہوگا کہ دوسروں کی رہگذر پر شعلہ بچھا کر ہم اپنی راہوں میں پھول

بکھیر لیں؟ دوسروں کو مٹا کر اپنی دنیا بسا لیں، اپنی خوشیوں کے محل دوسروں کے خوابوں کے راکھ پر تعمیر کریں؟؟ نہیں —— کبھی نہیں ——

اس لئے ہم ایک نئی راہ اپنا لیں۔ وہ سارے سپنے بھول جائیں۔ اب میں تمہارا نہ دیوتا رہوں اور نہ تم میری دیوی۔ میری زندگی! تم میرے لئے صرف کنول بن جاؤ اور میں تمہارے لئے صرف راشد!

میں جانتا ہوں اس فیصلے کے بعد دل میں ایک ناسور پڑ جائے گا۔ ہم نئی راہ اپنا کر اپنی زندگی کے راہ میں شعلے بچھا لیں گے!!! لیکن تم نے پڑھا ہوگا حق و انصاف کے لئے سقراط نے اپنے ہاتھوں سے زہر پیا تھا —— خدا حافظ۔

راشد

سوال

"اگر تم بازار جاؤ اور تمہیں ایک ہی قیمت میں ہیرا اور پتھر دونوں ملیں تو کیا خریدو گی؟ تمہارے علاج کے لیے میٹھی اور تلخ دونوں دوا یکساں مفید ہوں تو کون سی پیو گی؟؟"

تمہارا خط سامنے پڑا ہے۔ لیکن میں ان دو سوالوں کا جواب سوچتے سوچتے تھک گئی ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ان سیدھے سادے سوالوں کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میں تو سدا کی کند ذہن ہوں۔ بچپن سے یہی حال ہے۔ ہمارے مولوی صاحب سدا میری جان کو روتے رہے۔ اماں میری شکل دیکھ کر گھبرا جاتیں کہ کام تو کچھ کر نہ پاؤں گی لیکن ان کا دماغ ضرور کھا جاؤں گی۔ اسکول کالج میں لڑکیاں جو سوال ایک بار سمجھانے سے سمجھ جاتیں، میں چار چار بار سمجھانے پر بھی نہ سمجھ پائی۔

اب دیکھو نا، ان دو سوالوں کا جواب تو دے نہ پائی اور تیسرا سوال ذہن میں آگیا کہ "تم میرے کون ہو ——————؟؟"

یہ تو جانتی ہوں کہ تمہارے ابا میری اماں کے رشتے کے بھائی ہیں لیکن کیا ہم دونوں میں بھی کوئی رشتہ ہے ؟ ؟ نہیں ـــــــ

میں تمہیں بچپن سے جانتی تھی۔ تمہارا مکان اور میرا مکان پاس ہی میں تھا اور اسی لئے یہ دور کا رشتہ قریبی تعلق میں بدل گیا تھا۔ تمہارا مکان ہمارے مکان سے کافی بڑا تھا۔ تمہارے پاس کار تھی، ریڈیو تھا۔ زندگی کی آسائش کے سارے سامان تھے لیکن میرے یہاں کچھ نہ تھا۔ مہینے کے آخری دنوں کو کاٹنا ہم لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا۔ میرے ابا اس آفس میں کلرک تھے، جہاں تمہارے ابا افسر تھے۔ لیکن اماں کہتیں اس بلندی کے باوجود تمہارے ابا بھائی بہن کے رشتے کو نہ بھول سکے اور سدا اماں کو اپنی بہن سمجھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے یہاں روز آتے جاتے لیکن اس پیار محبت میں بھی ہمیں اپنے کمتر ہونے کا احساس شدت سے ہوتا اور ہمارا سر تم لوگوں کے سامنے جھکا رہتا۔ پتہ نہیں تم لوگ کیا سوچتے تھے!!

ہم تم بھی روز ملتے لیکن میں نے تمہارے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا تھا۔ ہاں اس وقت تو میں نے اپنے بارے میں بھی کچھ نہ سوچا تھا۔

آپا کی شادی تھی۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ میں جدھر سے گذرتی لوگ مجھے دیکھنے لگتے۔ جدھر جاتی اپنی تعریف سنتی۔ اسی وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میں بھی کچھ ہوں۔

اور اسی شادی کے ہنگامے میں لڑکیوں نے مجھے تم سے بات کرتے دیکھ لیا۔ تم کسی کام کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے لیکن ان لڑکیوں نے اس ذرا سی بات کا افسانہ بنا دیا۔ اتنا ستایا کہ بس خدا ہی یاد آ گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تم میرے

کچھ ہو بھی سکتے ہو !!

ان دونوں باتوں نے مجھے عجیب سے نشہ سے سرشار کر دیا۔ اپنے حسن کا خیال اور تمہارا تصور دونوں مجھے مدہوش بنا رہا تھا۔ میں قدم رکھتی کہاں تھی اور پڑتے کہاں تھے! مجھے کچھ بھی ہوش نہ تھا۔

آخر بارات کا دن بھی آ ہی گیا۔ میں نے خوبصورت بوٹوں والی سرخ ساری پہن رکھی تھی۔ مجھے جو بھی دیکھتا دلہن کہہ کر پکار اٹھتا اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔

کسی کام سے چھت پر گئی تو تمہیں وہاں اکیلے پایا۔ تم بیلے کی کلیوں کا ہار گوندھ رہے تھے۔ تم نے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں۔ میں چاہتی تھی، تم کچھ بولو کچھ کہو......... میں جو کچھ سوچ رہی تھی وہ تمہاری زبان سے سننا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنا کام بہت دیر میں ختم کیا۔ میں یکدم بھول گئی کہ اگر کسی نے ہم دونوں کو یہاں اکیلے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ میں بھول گئی کہ میرے ماحول میں یہ گناہ ہے ——— لیکن تم نے میری طرف دیکھا بھی نہیں ——— میں مایوس ہو گئی اور لڑکھڑاتے قدم سے واپس آ رہی تھی کہ تم نے مجھے پکارا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ تم بالکل سامنے کھڑے تھے اور بیلے کا ہار میری طرف بڑھا رہے تھے۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا، "یہ کیا ہے؟؟" تم نے کچھ جواب نہ دیا، صرف مسکرانے لگے۔ لیکن یہ مسکراہٹ؟؟ ہائے، ساری داستان کہے جا رہی تھی! سارا راز فاش کر رہی تھی۔ میں نے

جو کچھ چاہا تھا، مجھے مل گیا۔ میں نے چاہا کہ ہار لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دوں لیکن اسی وقت مجھے اپنے ابا یاد آئے۔ اپنی غربت اور تمہاری دولت یاد آئی۔ اس تہذیب اور ماحول کا خیال آیا، جس میں پلی تھی، پروان چڑھی تھی، جہاں یہ سب گناہ تھا اور میں چاہتے ہوئے بھی تمہاری طرف ہاتھ نہ بڑھا سکی۔ جلدی سے واپس جانے کے لیے مڑی۔ دو ہی چار سیڑھی اتری تھی کہ آواز آئی "شہنو! شہنو!" کوئی لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں مجھے پکار رہا تھا۔ میں آواز پہچانتی تھی۔ میرے قدم رک گئے۔ ایک طرف ابا تھے اور دوسری طرف تم! ابا جان ہی سے نیچے اترنے کو کہہ رہے تھے اور تم چھت پر آنے کو۔ ابا کی عزت مجھے نیچے کی طرف کھینچ رہی تھی اور تمہاری محبت مجھے اوپر لے جانا چاہتی تھی۔ عجیب کشمکش تھی! پھر آواز آئی، تم نے پھر پکارا تھا۔

ابا ہار گئے۔ جب میں نیچے اتری، میرے بالوں میں بیلے کی کلیاں کھل رہی تھیں۔
——اماں نے دیکھا تو برس پڑیں کہ کہیں کنواری لڑکیاں بھی پھول پہنتی ہیں؟؟

میری زندگی میں بہار آ گئی۔ تمہارا پیار میرے لیے بادِ صبا بن گیا اور میں کلی سے پھول بنتی گئی۔ میرے حسن کا چرچا ہر طرف، ہر جگہ ہونے لگا۔ جو بھی مجھے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میں خود جب آئینہ دیکھتی، تو اپنے پر پیار آ جاتا ساتھ ہی ساتھ ہماری محبت بھی بڑھتی گئی۔ لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے، میرے دل میں بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا کہ کوئی جان جائے تو پھر کیا ہوگا؟ شاید اماں مجھے زہر دیدیتیں۔

——— نہیں تو ابا خود زہر کھا لیتے۔

سنا ہے چرخ کج رفتار کو کسی کی خوشی نہیں بھاتی۔ میری خوشی بھی اسے نہ بھائی۔ تم ڈاکٹر ہو گئے تو تمہیں باہر بھیجے جانے کا ذکر ہونے لگا۔ پھر فیصلہ بھی ہو گیا کہ تین سال کے لئے تم امریکہ چلے جاؤ گے۔ یہاں حال یہ تھا کہ ایک دن بھی تمہیں دیکھے بغیر چین نہ آتا۔ تین سال کی دوری کا خیال ہی مایوسی ڈالتا تھا۔ میری عجیب سی حالت ہو گئی۔ اماں نے میری بے چینی اور بے قراری دیکھی اور شاید سب کچھ سمجھ گئیں۔ پابندیاں اور سخت ہو گئیں، ویسے پہلی بھی کم نہ تھیں۔ لیکن پابندیاں کی دیواریں، روک نہ سکیں میں تم تک پہنچ ہی جاتی۔ تم بھی پریشان تھے دونوں ایک دوسرے کو ڈھارس بندھاتے، ہمت دلاتے لیکن دل چھوٹے بہانوں سے کیا بہلتا؟

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا، جب تمہیں جانا تھا۔ تم نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ میں نے یہ فیصلہ بہت پہلے ہی کر لیا تھا۔ ہاں مجھے تم سے یہ شکایت ضرور ہوئی کہ تم نے مجھ پر اتنا بھروسہ نہ کیا۔ مجھ سے وعدہ لیا۔ میں نے تم سے کوئی وعدہ نہ لیا۔ مجھے تم پر بھروسہ تھا!!

تم چلے گئے اور اپنے ساتھ میرا سکون اور قرار بھی لیتے گئے۔ دن کاٹے نہ کٹتے اور راتیں تڑپ تڑپ کر گزرتیں۔ اماں پہلے ہی نالاں تھیں۔ اب ان کی شکایتیں اور بڑھ گئیں۔

اسی درمیان سنا کہ میرا پیغام آ رہا ہے۔ ان پیغاموں میں بڑے بڑے لوگوں کے یہاں کا بھی پیغام تھا۔ حسن دولت اور شہرت سب پر ہی حاوی رہا ہو

اماں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی بیٹی کی نسبت اتنے بڑے بڑے گھروں سے آئے گی۔ وہ فوراً حامی بھر دینا چاہتی تھیں۔ لیکن نہ جانے مجھ میں کہاں کی ہمت آگئی۔ میں نے صاف کہدیا کہ ایک سال تک شادی نہیں کرونگی۔ ابا نے سنا تو خاموش ہو گئے۔ لیکن اماں اور آپا نے وہ سنائی کہ خدا کی پناہ ——— کون سی بات نہ کہی۔

آنکھیں تمہیں دیکھنا چاہتی تھیں، کان تمہاری آواز سننا چاہتے تھے اور دل تمہاری قربت کے لئے تڑپ رہا تھا۔ عجیب بے قراری اور بیتابی تھی۔ پھر اس بیقراری اور پریشانی میں کوئی ہمدرد نہ تھا کوئی ہمراز نہ تھا۔ اس پر سے ایک مصیبت اور تھی۔ اماں اور آپا نے مجھے بالکل ہی نالائق سمجھ لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لڑکی اپنی شادی کے بارے میں بول سکتی ہے، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے خود سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ جب ایک سال ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ لوگ پھر مجھے شادی کیلئے ستائیں گے۔

فکر اور غم کی تیز آگ میں جلتے جلتے میری صحت پگھلنے لگی اور صحت ہی نہ رہی تو حسن کا کیا سوال؟ صحت اور حسن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حسن بھی رخصت ہونے لگا تو شادی کے پیغام کیا آتے؟ ایک بیمار لڑکی سے کوئی بھی شادی کو تیار نہ تھا۔ میں علاج کرتی ہی نہیں کیونکہ یہ بیماری تو میرے لئے رحمت ہے۔

تین سال بیت گئے اور ان تین سالوں میں میں بالکل بدل گئی۔ جس نے مجھے تین سال پہلے دیکھا، وہ اب دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔ چاندنی بری طرح

گھن لگ گیا تھا۔

پھر کچھ دنوں بعد تم آ گئے۔ میں تم سے مل نہ سکی۔ تم نے کتنے پیغام بھجوائے۔ آخر تین دن بعد جب میں کسی بہانہ سے تم سے ملنے گئی تو تم بھی مجھے پہچان نہ سکے جب پہچانا تو سکتہ میں آ گئے۔ میں اپنا دکھ درد بیان کرتی رہی، اپنی بے چینی اور بیقراری کا حال کہتی رہی لیکن تم بالکل چپ رہے۔

اب تم مجھ سے کترا رہے تھے، مجھے ایسا محسوس ہوتا لیکن جہاں تم میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتے، سارے شک دور ہو جاتے۔

ایک دن تمہاری امی آئیں تو انھوں نے بتایا کہ وہ اپنی بھانجی سے تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں اور تم شادی کرنے سے انکار کر رہے ہو۔ وہ تم سے بہت خفا تھیں، ان کے ساتھ اماں بھی ـــــ لیکن میں خوش تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تمہارے انکار میں میرا پیار دھڑک رہا ہے۔

پھر میں نے سنا کہ تم نے اپنے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔ تم نے نجمہ کو اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے۔ نجمہ کے حسن کا چرچا آج ویسے ہی ہے، جیسے تین سال پہلے میرے حسن کا تھا!!

مجھے یقین نہ آیا۔ میں اس روز بہت مشکل سے تم سے ملی اور بے اختیار پوچھ بیٹھی یہ سب کیا ہے؟؟ تم کچھ کہنے ہی جا رہے تھے کہ کچھ آہٹ ہوئی اور مجھے مجبوراً وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

آج تمہارا خط آیا۔ خط میں تم نے اپنے پیار کا اقرار کیا ہے۔ یہ بھی لکھتے ہو کہ میرے بغیر تمہاری زندگی میں اندھیرا چھا جائے گا لیکن اس سے بھی انکار

نہیں کہ نجمہ کو تم نے خود چنا ہے۔ تم نے لکھا ہے ــــــ "تم اگر بازار جاؤ اور تمہیں ایک ہی قیمت پر ہیرا اور فیروزہ دونوں ملیں تو کیا خریدو گی ؟ تمہارے علاج کے لئے میٹھی اور تلخ دونوں دوا یکساں مفید ہو تو کون سی دوا پیو گی ؟؟
اور میں سادہ لوح اس معمولی سوال کا بھی جواب نہیں دے پا رہی ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اب میں کسی بھی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں رہی ــــــ اب تو میں ہوں اور حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا اندھیرا ہے جو ہر لمحہ، ہر پل اور گہرا ہوتا جا رہا ہے اور بھیانک ہوتا جا رہا ہے! اس اندھیرے میں میرا وجود ڈوبتا جا رہا ہے ــــــــــــ

اب اپنے ان سوالوں کا جواب تم خود سوچ لو !!

ــــــــــــــــــــ

کہتے ہیں وقت ہر داغ مٹا دیتا ہے۔ ہر زخم پر پھایا رکھ دیتا ہے چاہے وہ "داغ" زخم عشق کے طفیل ملا ہو یا گناہ کے۔ لیکن آج عائشہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پچیس سال کے بعد اس کے زخم کو کیوں کریدا جاتا۔ اس کے دامن کے داغ کو کیوں نمایاں کیا جاتا ——— وہ داغ ——— وہ زخم ——— اف!! اس نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

عائشہ اپنے بال سنوار رہی تھی کہ اسے آہٹ ملی کہ کوئی آرہا ہے

کون؟ اس نے پوچھا۔

"میں" ناجو بولی۔

اوہ ناجو! تم کل کیوں نہیں آئیں؟

اماں نے آنے نہیں دیا۔ وہ کہتی ہیں لڑکیوں کا روز روز گھومنا اچھا نہیں۔ ناجو نے روہانسی ہو کر کہا۔

عائشہ نے ناجو کو دیکھا اور مسکرادی۔ بچپن ہی میں عائشہ کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس کے ابا نے دوسری شادی نہ کی۔ انھوں نے سوچا سوتیلی ماں ان کی بچی پر ظلم ڈھائے گی۔ اور آج پورے گھر کی مالک عائشہ ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عائشہ۔ عائشہ کا جو دل چاہتا کرتی۔ اس کے ابا کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی کہ اپنے رشتہ داروں میں نہیں بنتی۔ ان کے ابا کہتے۔ ان کے رشتہ دار ان کے دولت دیکھ کر جلتے ہیں۔ دولت! ہاں دولت اس کے ابا کے پاس بہت تھی۔ اس نے جب جس چیز کی فرمائش کی اس کے ابا نے پوری کر دی۔

کیا سوچ رہی ہو؟ ناجو نے اسے ٹہوکا دیا۔

کچھ نہیں! جانتی ہو رحیمن ہے نا ـــــ ارے میری دائی رحیمن۔

ناجو کو عائشہ کی پندرہ سالہ دائی یاد آگئی۔

"ہاں وہی رحیمن جو آم کی کریاں لاتی ہے ـــــ کیا ہوا؟"

"اسکی آنکھ نکورن تو کے بیٹے سے لڑ گئی ہے۔ دونوں چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔"

عائشہ ایسی باتیں مت کرو۔ یہ سب بری باتیں ہیں۔ کوئی سن لے گا تو کیا ہو گا۔

ناجو! تم کیوں اتنی خوفزدہ ہو۔ یہاں میرے سوا کون ہے یہاں سب کچھ میں ہوں۔

لیکن یہ سب بری باتیں ہیں ان سے شرم ہٹ جاتی ہے۔

اوہنہ ! جب کوئی چاہنے والا ملے گا۔ تب سمجھوگی ان باتوں کا مطلب۔

خدا نہ کرے اگر ایسا ہوا تو میں ڈوب مرونگی۔

جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ میری جان۔

تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں جاتی ہوں۔

اسی زمانے میں خالہ امی آئیں۔ ان کے ساتھ رفو بھیا بھی تھے۔ رفو بھیا نوجوان تھے۔ خوبصورت تھے۔ اور شاعر تھے۔ اسے جب بھی تنہا دیکھتے۔ ایک دو مصرعے اسکے گال اس کے بال اور اس کے جمال پر کہہ دیتے۔ وہ شرماجاتی۔ لیکن دونوں کی نظریں ٹکرا جاتیں۔ اسے رفو بھیا بہت اچھے لگتے۔ اور وہ بھی اسکے دیوانے تھے۔ بات شعر و نظم سے ہوتی ہوئی خط و کتابت تک پہنچ گئی۔ ان دونوں نے اپنے اس دل کے معاملہ کو راز ہی میں رکھنا چاہا۔ لیکن کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ اسکے جاں نثار راز داروں نے اسکے راز کو پورے شہر میں پھیلا دیا۔ بات اس کے ابا تک پہونچ گئی۔ اور انہوں نے اسی وقت خالہ اور رفو بھیا کو چلے جانے کا حکم دیدیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عائشہ بچی ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ رفو اور اسکے باپ کے پاس کیا رکھا ہے۔ آخر میری بچی کہاں سے کھائے گی۔

رفو بھیا اسکے ابا کی طرح دولت مند نہ تھے۔ لیکن غریب بھی نہ تھے۔ پھر پیار یہ سب کہاں دیکھتا ہے۔ محبت میں تو صرف دل کا سودا ہوتا ہے۔

اور بس! لیکن وہ ابا سے یہ ساری باتیں نہ کہہ سکی۔ اس کے اور رفو کے درمیان سدا کے لئے دیوار کھڑی کر دی گئی۔ کانٹوں کی دیوار! جنھیں پھلانگنا زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ پیر کانٹوں سے ٹکرا کر لہو لہان ہو جاتے۔

عورت سب کچھ بھول جاتی ہے۔ لیکن اپنا پہلا پیار نہیں بھولتی ہر دکھ، ہر سکھ میں اسے اپنا محبوب یاد آتا ہے۔ اگر "وہ" ہوتے تو؟ یہ خیال اسے ساری زندگی بے چین اور بے قرار رکھتا ہے۔ اس کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اتنا بھاری غم اکیلے سہہ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ کوئی راز دار ہوتا، کوئی ہمراز ہوتا جس سے وہ سب کچھ کہہ دیتی۔ لیکن اسے کون سمجھتا۔ اس کے ابا تو سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنے ہوئے تھے۔ اسی غم کے اندھیرے میں ایک کرن لہرائی۔ اور وہ تھیں نامو آپا۔ اس سے بہت پیار کرتیں۔ اور رجو بھیا کا کہنا ہی کیا۔ وہ ایسے ایسے مذاق کرتے کہ اس کا نوخیز اور کنوارا جسم شرم و حیا سے کانپ جاتا۔ نامو آپا اس کی چچا زاد بہن تھی۔ وہ اور ان کے دولہا رجو بھیا اس سے ملنے اور غم دور کرنے روز روز آنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اور عورت تو امر بیل ہے۔ امر بیل جو قریب کے درخت کا سہارا لے کر جیتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ رجو بھیا رفو کے دیئے ہوئے سارے دکھوں کا مداوا بن گئے۔ اکیلے میں تنہائی میں جب وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے تو وہ گھبرا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ نہ جانے

کیوں اسے اس مسکراہٹ سے خوف آتا۔ اسے اس وقت رفو سے کیا ہوا وعدہ یاد آجاتا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جو بھیا کی یہ مسکراہٹ رفو کی امانت میں خیانت کرنے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن جب طوفان آجاتا ہے تو اسے روکا نہیں جاسکتا۔ طوفان آچکا تھا۔

دونوں قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ دونوں یہ بھول چکے تھے کہ دونوں کون ہیں؟ نہ اسے یہ یاد تھا کہ وہ جو بھیا نامو آپا کی امانت ہیں۔ اور وہ خود رفو بھیا کی۔ اور نہ انھیں کچھ یاد تھا۔ آخر یہ حقیقت ایک دن سب پر منکشف ہوئی۔ اور انھیں سدا کے لیے جدا کر دیا گیا۔

اس کے ابا نے اس کی شادی نواب زادہ احمد سے کر دی۔ لیکن سہاگ رات ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ یہ شکل و صورت کے ساتھ سیرت سے بھی کچی دامن ہے۔ اپنی قسمت کے اس ظلم پر اسے بہت رونا آیا۔ اس دن بہت دنوں بعد اسے رفو یاد آگئے۔ رفو ایک کامیاب شاعر ہو گئے تھے۔ ان کی ہر نظم، ہر غزل اور ہر شعر میں اس کا پیار اس کا وجود اس کی جدائی کا غم دھڑکتا تھا۔ لیکن اب رفو کی یاد سے فائدہ ہی کیا تھا۔ اس نے رفو سے وفا ہی کب کی تھی۔ رفو نے اس کے لئے خود کو برباد کیا۔ لیکن اس نے؟ وہ تو رجو بھیا کے دامن سے بندھ چکی تھی۔ لیکن اس نے جو بھی کیا۔ کیا خود سے کیا؟ نہیں اس کے ابا نے اس کو مجبور کر دیا۔ اگر دولت کی پٹی ابا کی آنکھ پر نہ بندھی ہوتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔

اس نے اسی رات۔ شادی کی پہلی رات۔ فیصلہ کیا کہ وہ بغاوت کر دے گی۔ ابا نے جس طرح اس کے ارمانوں سے کھیلا ہے۔ اس طرح وہ ان کی عزت سے کھیل جائے گی۔ اس نے سسرال جانے سے انکار کر دیا۔ دولہا میاں خود اس سے ملنے کے لئے آجاتے۔ لیکن ان دونوں کے تعلقات صرف نام کے تھے۔ اس کا زیادہ وقت رجو بھیا اور نامو آپا کے ساتھ گزرتا۔ کچھ دنوں بعد وہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ لوگوں نے ان بچوں کو جائز ماننے سے انکار کر دیا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے ابا کا سر سدا سدا کیلئے جھک چکا تھا۔ آخر یہ غم سہتے سہتے ایک دن وہ اس دنیا سے نامراد مایوس سدھار گئے۔

اب کوئی نہ تھا جو اسے رجو بھیا سے قریب تر ہونے سے روکتا رجو بھیا بھی اس پر جان چھڑکتے۔ نامو آپا سب دیکھتیں۔ لیکن ان کی پیشانی پر شکن نہ آتی۔ اس نے بھی بدلے میں اپنی دولت، اپنی روح، اپنا دل، اور اپنا وجود سب انھیں سونپ دیا۔ وہ اسی نشہ میں مدہوش تھی اسے دنیا کی کوئی خبر نہ تھی۔

لیکن کچھ ہی دنوں بعد جب وہ اس مدہوشی سے ہوش میں آئی تو بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ چند لمحہ کیف و سرور کے لئے اس نے اپنی محبت، اپنی شرافت اور اپنی دولت سب کچھ کھو دیا۔ رجو بھیا صرف اس کے حسن و شباب، اس

کی ساری پونجی لینے کے بعد وہ اسے بھول چکے تھے۔ ناموآپا صرف بے وقوف بنانے کے لئے اس سے پیار کر رہی تھیں۔ ناموآپا اور راجو بھیانے اسے مل کر لوٹا تھا لیکن اس نے بھی مزاحمت نہ کی تھی۔ اب وہ بھری دنیا میں تنہا تھی۔ گو خاندان میں ماں باپ کے سوا سب ہی تھے۔ پھر بھی اس کا کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کا شوہر بھی سلامت تھا۔ لیکن اس کے دروازے اس کے لئے بند تھے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ گناہ کا سایہ اس کے سر پر پڑے۔

مجبوراً بے بس ہو کر اسے ناموآپا اور راجو بھیا کے قدموں تلے زندگی گزارنا پڑی۔ کچھ دنوں بعد لوگ سب کچھ بھول گئے۔ اس نے ایسا ہی سمجھا۔ لیکن آج اسے معلوم ہو گیا کہ خیال غلط تھا۔

وقت کا دھارا سارے گناہوں کو نہیں دھو سکتا۔

وقت سارے غم، سارے دکھ کا مداوا ہو سکتا ہے۔ لیکن گناہوں کا داغ نہیں مٹا سکتا۔!! آج جب اس نے اپنی بیٹی کی نسبت ماجو کے بیٹے سے بھیجی تو جواب ملا۔ "جان کر مکھی کون نگلے ؟"

چنگاری کی آنچ

"شمی آپا! دولہا بھائی آرسی مصحف کے لیے آرہے ہیں ـــ مبارک باد" تزئین یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اور وہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ تزئین نے جاتے وقت کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرے کی تنہائی سے مطمئن ہو کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا بدن تھکن سے چور چور ہو رہا ہے۔ اور اس نے انگڑائی لینے کو ہاتھ اٹھایا۔ لیکن انگڑائی لے بھی نہ سکی تھی کہ ہاتھ خود بخود گر گئے۔ وہ چپ چاپ صرف اپنے ہاتھ کو دیکھے جا رہی تھی۔ نرم نرم سرخ و سپید ہاتھ کو ـــ جو سرخ چوڑیوں اور زیوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان مخروطی انگلیوں کو جو قیمتی انگوٹھیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ جو مہندی کے رنگ میں سہاگ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ الٹ دیا۔ اور سرخ ہتھیلی سامنے آگئی۔ مہندی نے اس کی گلابی رنگت کو دہکا دیا تھا۔ اور وہ شعلہ کی مانند لہک رہی تھیں۔ اسے اب محسوس ہوا کہ یہ شعلہ لو دے رہا ہے۔ اسکی

تپش بڑھتی جا رہی ہے۔ اور وہ اس آنچ، اس تپش میں جل جائے گی۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ، اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔۔۔ لیکن کپڑوں میں بھی آگ کی رنگت تھی۔ سرخ سرخ، لال لال! یہ کپڑے آگ جیسے معلوم ہو رہے تھے۔ آگ میں بھی تو اتنی ہی چمک دمک ہوتی ہے۔ اس نے ڈر کر سہم کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور ہر طرف اسے آگ ہی آگ نظر آئی۔۔۔ کمرہ سرخ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ کے لئے جتنے بھی سامان تھے، سرخ تھے۔

وہ چاروں طرف گھبرا گھبرا کر نظر دوڑا رہی تھی۔ اور آخر میں آئینہ پر آ کر اس کی نظر رک گئی۔ اسے آئینہ میں اپنی شبیہ نظر آئی۔ ۔۔۔ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ۔۔۔ بوجھ سے لدی ہوئی ۔۔۔ آگ میں جلتی ہوئی ۔۔۔ پیشانی پر ٹیکا تھا۔ ناک میں نتھ تھی، کانوں میں جھمکے تھے گلا اور دونوں ہاتھ زیوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ پیروں میں بھی زیور تھے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا یہ نتھ، یہ کنگن، یہ کپڑے، یہ مالائیں سب زنجیریں ہیں جو اسے جکڑے ہوئے ہیں۔ جو اسے اب کبھی آزاد نہ ہونے دیں گے یہ سارے زیور بوجھ ہیں۔ جن کے تلے وہ دب جائے گی۔ یہ سرخ کپڑے آگ ہیں۔ جن میں وہ جل جائے گی! ۔۔۔ ان خیالوں سے ڈر کر سہم کر، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اسے اپنے پچھلے دن یاد آنے لگے۔

اس کی عمر ۹ سال ہوگی جب اماں نے بتایا تھا کہ تمہارے ماموں اپنے لڑکے کے ساتھ آرہے ہیں۔ لڑکا تم سے بڑا ہے اس لئے

اسے بھیا کہنا۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی بھیا نہ کہہ سکی۔ کیوں کہ آپا اسے عرشی کہتی تھیں۔

عرشی جب تک رہا اس سے اور عرشی سے ٹھنی رہی۔ وہ آپا کا دوست تھا۔ ان کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتا اور اسے پوچھتا بھی نہیں ۔ وہ ان دونوں کے پاس جاتی تو عرشی اسے بیوقوف بناتا۔ چڑاتا اور آخر وہ عاجز آکر خود وہاں سے ہٹ جاتی۔

وہ ابا کی بیٹی تھی، اور آپا اماں کی۔ اس لیے وہ ابا سے شکایت کرتی "آپا اور عرشی ہر وقت کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ ان کے پاس جاتی ہے تو عرشی اسے بھگا دیتا ہے"

ابا کے بولنے سے پہلے اماں اسے سنانا شروع کر دیتی تھیں۔ "ہر وقت نغمی کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس کی کوئی خوشی، کوئی سکھ اسے نہیں بھاتا۔ بچپن سے اس کا یہی حال ہے۔ جب بھی نغمی کے ہاتھ میں کوئی کھلونا دیکھتی بس چیخ پڑتی اور اسے لے کر ہی دم لیتی۔ میری بچی خاموشی سے اسے اپنا کھلونا دے دیتی" وہ اتنی ساری باتوں کا وار نہ سہہ پاتی اور رونے لگتی۔ ابا اسے پیار سے لے کر باہر چلے جاتے ۔۔۔ ماموں اور عرشی چلے گئے۔ لیکن آپا کے پاس عرشی کے برابر خط آتے رہے۔

وقت گزرتا گیا۔ اور اب اماں، آپا کو تنبیہ کرنے لگیں، سمجھانے لگیں۔ "ایسے مت چلو، اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اور ابھی تک کام کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔" ابا، آپا کے خطوں کا سنسر کرنے لگے۔ آپا سے

دیکھتیں، سب سنتیں، لیکن خاموش رہتیں۔ مضمحل ہو جاتیں اور ان کے سپید گال زرد ہو جاتے۔ کبھی کبھی اپنے ہونٹ کو چبانے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کسی جذبہ کسی آگ، کو دبا رہی ہیں۔

خدا جانے آپا یہ سب دیکھ کر کیا محسوس کرتیں۔ لیکن وہ تو جوانی سے خوف کھانے لگی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو اپنی جوانی نما بے شباب کو روک دیتیں۔ اتنی پابندی اتنی قید کیسے پسند ہو گی؟ آپا کا زیادہ وقت تنہائی میں گذرنے لگا۔ وہ سب سے الگ الگ رہتیں۔ ایسا محسوس ہوتا سارے لوگوں سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ سبھی ان کے لیے غیر بن گئے ہیں۔ ہاں، اپنے کپڑے، اپنے روپ، اپنے بناؤ سنگار کا خیال زیادہ رہنے لگا تھا۔ ویسے آپا کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔

آپا کے حسن کا شہرہ خاندان میں دور تک پھیل گیا۔ آپا تھیں بھی بہت پیاری۔ دبلی پتلی سی۔ گوری گوری سی، ہر دل میں بس جاتیں۔

میری اور عرشی کی اب بھی نہیں بنی۔ جھڑپیں ہوتی رہتیں۔ آپا خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہتی۔ ویسے عرشی ان کا بہت خیال کرتے۔ عرشی کے تمام لوگ اب یہیں آ گئے تھے۔ اس لیے وہ روز شام کو آتے۔ اگر ان کے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو آپا بے چین ہو جاتیں۔ تزئین اور وہ کبھی کبھی انھیں چھیڑ دیتیں۔ آپا تلملا جاتیں۔

وقت گزرتا ہی گیا۔ حالانکہ اس نے بہت چاہا تھا کہ وقت رکا رہے۔ تھما رہے۔ لیکن کس کے چاہے سے ایسا ہوا ہے۔ جو اس کے چاہنے

سے ایسا ہوتا۔ آپا، ساجو آپا، تزئین اور اس پر پابندیاں بڑھنے لگیں
قدم قدم پر روک ٹوک ہونے لگی۔ آپا سے اس کا مقابلہ ہونے لگا۔ اور وہ
آپا ہی کے سے نہیں خاندان کی ساری لڑکیوں سے زیادہ پیاری، اور زیادہ
خوبصورت سمجھی جانے لگی۔

اسی درمیان آپا کو منسوب چچا جان کے یہاں سے آئی۔ رضی
بھیا بہت بڑے افسر تھے۔ ہزاروں کماتے اور خرچ کرتے تھے۔ لیکن لوگوں
کا خیال تھا کہ آپا سے ان کا جوڑ نہیں تھا۔ آپا سے وہ چودہ پندرہ سال
بڑے تھے۔ پھر بھی آپا کی شادی رضی بھیا سے ہو گئی۔

تزئین نے اسے بتایا کہ خالہ اماں، خالو ابا سے کہہ رہی تھیں کہ
انھوں نے باجی کو بہت کہا کہ عرشی گھر کا لڑکا ہے اپنا بچہ ہے، اسے بھیجے
۔۔۔ لیکن باجی اور دولہا بھیا نے کہا کہ رضی بھی اپنا بچہ ہے۔ اگر عمر زیادہ ہے
تو کما بھی زیادہ رہا ہے۔ جب کہ عرشی کسی کام سے اچھی طرح ابھی نہیں لگ سکے
ہیں۔۔۔ تزئین ہی نے بتایا کہ رفو بھیا کہہ رہے تھے کہ جب انھوں نے عرشی
کو منسوب بھیجنے کے لیے کہا تو عرشی نے کہا کہ وہ منی سے زیادہ خوبصورت
دلہن پائیں گے۔

آپا اپنے گھر چلی گئیں۔ عرشی ڈگری لانے کیلئے امریکہ چلے گئے۔ ابا
ریٹائرڈ ہو گئے۔ اور پھر انھیں شوق ہوا کہ ساری دنیا کی سیر کریں۔ ابا اسے
اور اماں کو لے کر ساری دنیا کی سیر کیلئے روانہ ہو گئے۔ اس نے دیکھا باہر
کی لڑکیاں کتنی بہادر ہوتی ہیں۔ اپنے حق، اپنی خواہش، اپنی آرزو کی تکمیل،

کیلئے سارے رشتے ناطے توڑ دیتی ہیں۔ اس شعر نے اسمیں ایک نئی طاقت نئی ہمت عطا کی۔

ایک دن وہ اپنے گھر، اپنے ملک لوٹ آئی۔ تزئین نے اسے بتایا کہ وہ عرشی کی دلہن بننے جا رہی ہے۔ اسے یقین نہ آیا۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا؟ جو اس کی آپا کا تھا اس کا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا ہے۔ وہ عرشی کو آپا کا دولہا سمجھتی تھی۔ اب وہی عرشی اس کا دولہا بن سکتا ہے؟ نہیں، کبھی نہیں۔! وہ آپا سے کبھی شرمندہ نہ ہوگی۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب اماں نے آپا کی عرشی سے ہنیں کی۔ تو پھر اس کی کیسے کریں گی۔ عرشی نے تب تو آپا کو ناپسند کیا تھا۔ جب اسے آپا نہ پسند آئیں۔ تو وہ کیا پسند آئے گی۔ لیکن تزئین کی بات سچی تھی۔ اس کی نسبت عرشی سے طے پا گئی۔ عرشی اب باہر سے ڈگری لے آیا تھا۔ اب اس کا مستقبل روشن تھا۔ اس لئے وہ اماں ابا کو پسند تھا۔ اور خود اسکے حسن کا کیا کہنا۔ اسے اب پتہ تھا کہ باہر کے لوگ تب اسے دیکھ کر چند لمحے کے لئے سکتہ میں آجاتے تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ انکار کر دے گی۔ لیکن اس کی نظروں میں ابا اماں کی عزت کا سوال اٹھا، اپنی رسوائی کا خیال آیا تو یہ ارادہ ڈگمگا گیا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اور ایک روز آپا بھی آ گئیں لیکن وہ آپا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکی۔ اس کی نظر ان کے سامنے اٹھتی کہاں تھی؟ آپا گھر کے کام میں لگ گئیں۔

آج انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا، کمرہ بھی انہوں نے

سمجھایا، اور وہی عقد کے وقت اس کے پاس کھڑی تھیں۔ ویسے اسے کچھ بھی یاد نہیں احساس نہیں کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ اسے اماں کا صرف ایک جملہ جو وہ بچپن میں کہتی تھیں یاد آ رہا ہے۔ وہی جملہ اسے ہر طرف سنائی دے رہا ہے "سدا سے اس لڑکی کو نغمی سے ضد ہے جہاں نغمی کے پاس کوئی چیز یا کھلونا دیکھی اسے چھین لینے کے لئے مچل گئی۔ اور آخر اسے لیکر ہی دم لیا نغمی خاموشی سے اسے اپنی چیز دے دیتی ہے ......"

اور آج آپا نے اسے اپنی عرشی کو بھی دیدیا۔ لیکن اس نے عرشی کی آرزو کی تھی؟ خواہش کی تھی؟ نہیں، اسے عرشی کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ عرشی کو پا کر وہ آپا ہی سے نہیں، خود سے بھی شرمندہ ہے۔ آج اسے اپنے خواب اپنی امید، اپنے تصور سے شرم آ رہی ہے۔ آخر اس نے کس کے سہارے، پیارے پیارے اتنے سارے خواب دیکھ لیے تھے۔ اتنی ساری آرزوئیں جگا لی تھیں۔ کیسے اس نے تصور میں، خواب میں رفو سے سدا ساتھ نبھانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کسی کو بتا سکے، کہہ سکے کہ وہ رفو کو پوجتی ہے۔ یہاں تک کہ آہ رفو کو بھی خبر نہ ہونے دی تھی ـــــ کہ وہ اسے پوجتی ہے۔

چوٹ

تم سامنے مسہری پر لیٹی ہو۔ تم نے باریک سی سرخ نائلون کی ساری پہن رکھی ہے۔ یہ باریک سی ساری تمہارے جسمانی تناسب کو کچھ اور نمایاں کر رہی ہے۔ تمہاری پتلی کمر، ابھرا سینہ اور متناسب کولہا صاف نظر آرہا ہے اور میرے جذبۂ شوق کو ابھارنا چاہتا ہے۔ لیکن میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جذبۂ شوق نہیں ہے، کوئی پیار نہیں ہے۔ میں نے سدا تم سے نفرت کی ہے اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ ان دنوں بھی مجھے تم سے کوئی لگاؤ نہیں تھا جب ہم دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور آج بھی جب اچانک تم سے ملاقات ہوگئی ہے۔

تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وقت بہت تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے۔ پٹنہ سیٹی کی ایک چھوٹی سی گلی میں ہم دونوں کا مکان تھا۔ میرے ابا اور تمہارے ابا اپنے چار بھائی تھے۔ ٹوٹا پھوٹا، کھنڈر سا یہ مکان ہمارا موروثی مکان تھا۔ مکان کے سامنے بہت سی زمین تھی، اور اسی زمین پر ایک بہت بڑا سا، گھنا سا آم کا پیڑ تھا۔ اسی آم کے پیڑ کے نیچے ہم، تم، شاہینہ اور زرینہ

کھیلا کرتے تھے۔

شاہینہ تمہاری خالہ زاد بہن تھی۔ اس کے اماں، ابا ہندو مسلم فساد میں مارے گئے تھے۔ بن ماں باپ کی بچی سے کون محبت کرتا ہے، جو تم کرتیں، چچا ابا، چچی اماں کے ساتھ تم بھی اس پر سدا حکم چلاتیں اور دبلی، پتلی، بیمار سی وہ لڑکی، تم لوگ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار رہتی۔ وہ گھر کا سب کام کرتی اور تم لوگوں سے ڈانٹ بھی سنتی۔ تم لوگوں کی اس بے رحمی نے میرے دل میں تمہارے لئے نفرت کا بیج بویا لیکن دوسری طرف شاہینہ کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

وقت گذرتا گیا اور ہم لوگ بڑے ہوتے گئے۔ جیسے جیسے سمجھ آتی گئی، ویسے ویسے علم ہوتا گیا کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟؟ ابا بتایا کرتے کہ ان کے دادا ابا کے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ لیکن وقت نے کس کا ساتھ دیا ہے؟ اب ابا کے پاس ان دنوں کی یاد اور اس مکان کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس غربت کے باوجود پورے خاندان میں جاننے والوں میں ہماری ایک عزت، ایک ساکھ تھی۔ لوگ ہمیں ایماندار، نیک اور سچا سمجھتے تھے۔

بات بھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ بڑے ہوتے گئے اور جوان ہو گئے۔ تمہارے حسن کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ تم ہو بھی بہت خوبصورت؛ سڈول جسم، گلابی رنگ، کتابی نقشہ، کنول سی آنکھیں، سیاہ لمبے بال، موتی جیسے دانت، خدا نے تمہیں کیا نہیں دیا ۔۔۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں تمہارے لئے کوئی آگ نہیں بھڑکی کیوں کہ تم مغرور تھیں، بد دماغ تھیں۔ تمہیں اپنے حسن کا بہت احساس تھا۔ شاہینہ پر شاید جوانی آئی نہیں! کیوں کہ اس میں کچھ

بھی فرق نہیں آیا تھا۔ ویسا ہی دبلا پتلا جسم، ویسی ہی سانولی رنگت اور ویسا ہی ڈرا ڈرا، سہما سہما انداز ـــــ مجھے بار بار نہ جانے کیوں اس کا خیال آتا ہے؟ ـــــ

ایم۔ اے کرنے کے بعد ایک اسکول میں دو سو روپیہ ماہوار پر نوکر ہو گیا۔ میری نوکری ہونے کے بعد اماں کو میرے لئے دلہن لانے کا خیال ستانے لگا۔ اور ایک دن اماں نے مجھے بتایا کہ وہ تمہارے یہاں میرا پیغام لے کر جا رہی ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاہینہ کو اس نے میرے لئے چھانٹا ہے کیوں کہ شاہینہ تم سے بڑی تھی۔ اور خوش ہو گیا۔ لیکن شام کو جب اسکول سے گھر واپس آیا تو زرین مجھ سے لپٹ کر رونے لگی "بھیا" شمو آپا نے آپ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ـــــ وہ کہتی ہیں کہ دو سو روپیہ میں کیا ہو سکتا ہے؟ زندگی سکھ اور چین چاہتی ہے اور ان کو بغیر روپیہ کے حاصل نہیں کیا جا سکتا؟"

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اماں تمہاری برائی کرتی رہیں۔ ابا نہیں خاموش رہنے کو کہتے رہے لیکن میں ایک خلا میں نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا؟ مجھے اپنی توہین بے چین اور بے قرار کئے ہوئے تھی۔ تمہارے انکار نے میری خودی پر ضرب لگائی تھی۔ مجھے تم سے کوئی محبت نہیں تھی، کوئی لگاؤ نہیں تھا پھر بھی تمہارے انکار نے مجھے میری نظروں سے گرا دیا تھا۔ میری انا جاگ اٹھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا بدلہ لونگا اور بدلہ لینے کے لئے امیر بننا ضروری تھا کیوں کہ تم دولت کی بھوکی تھیں۔ لیکن کس طرح راتوں رات دولت مند بن جاتا؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ تب مجھے فلمی دنیا، فلمی اداکار یاد آ گئے۔ میں نے آئینے میں اپنے کو دیکھا اور پرکھا ـــــ میں خوبصورت تھا، اسمارٹ تھا۔ پھر اپنے جسم، اپنے حسن سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا۔ اس لئے میں بھی

بھاگ آیا۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے ماحول، میری دنیا میں قلم لاہوں کی کوئی عزت نہیں ہے لیکن میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ حق اور سچائی کی بھی کوئی عزت نہیں ہے۔ شروع شروع میں مجھے بمبئی میں بارہا مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انتقام کی آگ میرے ارادے کو ڈگمگانے نہیں دیتی تھی۔ آخر ایک دن میری کوشش کامیاب ہو گئی اور میں "نورتن" میں ہیرو بن کر آیا۔ پکچر ریلیز ہوئی اور اس کا ہیرو راتوں رات عوام کا ہیرو بن گیا۔

میری مانگ بہت بڑھ گئی۔ ایک طرف مجھ پر روپیہ کی بارش ہونے لگی اور دوسری میری شہرت آسمان کو چھونے لگی۔ لیکن اس دولت اور شہرت نے میرے دل کا سکون چھین لیا۔ "نورتن" ریلیز ہونے کے تھوڑی دنوں بعد مجھے ابا کا خط ملا، جس کا دو تین جملہ مجھے آج بھی یاد ہے ...... "تم نے جو کچھ کیا، اچھا کیا، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، جو تمہیں ایک طوائف کا درجہ دے رہا ہے۔ طوائف بھی اپنا حسن، اپنا جسم، اپنی ادا بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہے اور تم بھی اسی راہ پر چل رہے ہو۔ ہاں میرے گھر کا دروازہ تمہارے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ تم جہاں بھی رہو خوش رہو لیکن میرے پاس مت آنا۔"

اس خط کو پا کر مجھے خیال آیا کہ یہ دولت، یہ شہرت میرے کس کام کی؟ اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچا؟ تب مجھے یاد آیا کہ میرے زندگی کا مقصد تو ایک لڑکی سے انتقام لینا ہے۔ اس لڑکی سے، جس نے دولت کی کمی کے سبب مجھے ٹھکرا دیا۔

لیکن اس انتقام کی آگ نے بھی میرے دل کو قرار نہ دیا۔ مجھے میرے اپنے

لوگ یاد آتے رہے۔ میرا دل ان کے لئے تڑپتا رہا ۔۔۔ میں خود اپنے کئے پر مطمئن نہیں تھا۔ اپنی اس بے قراری اور بے چینی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مجھے شراب اور عورت کا سہارا لینا پڑا۔ ہر رات میرے پاس ایک نئی لڑکی آنے لگی۔

اور آج جو لڑکی آئی، وہ تم تھیں ۔۔۔۔ تمہیں دیکھ کر میں چکرا گیا کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئیں ؟ لیکن مجھے فوراً یاد آیا کہ دولت کی ہوس انسان کو سدا گنہگار بناتی ہے۔ پیسہ کا لالچ ہمیشہ بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مجھے تم سے انتقام لینا ہے۔ یہ تم ہی ہو جس کے کارن میں اپنے لوگوں سے چھوٹا، اپنی نگاہ میں ذلیل ہوا اور خدا کی نظر میں گنہگار بنا ۔۔۔ لیکن کیسے بدلہ لوں ؟ کیا کروں ؟؟

خیال آیا کہ تمہارا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن تم مر گئیں تو میرا کیا فائدہ ! میں تو تمہیں اپنی طرح تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رات گذارنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ اب تو تم یہی کاروبار کرتی ہو ۔۔۔ تمہیں اس سے کیا تکلیف پہنچے گی۔

پھر کیا کروں ؟ تب میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے شادی کر لوں شادی کے بعد تمہارے سامنے دوسری لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤں ! تم تڑپتی رہو، جلتی رہو اور میں مسکراتا رہوں ۔۔۔ اپنے فیصلہ سے مطمئن ہو کر میں نے تم سے پوچھا "شمو، تم مجھ سے شادی کرو گی ؟؟

میں نے تمہاری خاموشی سے تمہاری رضامندی کا اندازہ لگایا اور کہا "گھبراؤ نہیں۔ کل صبح آٹھ بجے ہم دونوں کا نکاح ہو جائے گا ۔۔۔"

لیکن تم، میرے خاندان کی ایک لڑکی نے فوراً جواب دیا ، "بادشاہ کے سر پہ تاج اسے عزت کی ضمانت دیتا ہے، اسی طرح عورت کا سر تاج بھی ہے آپ کے پاس دولت، شہرت، نام اور عیش و عشرت کے سارے سامان ہیں لیکن حقیقت میں آپ کیا ہیں ؟ آپ کے پاس وہ عزت کہاں ہے؟ جو شرافت، سچائی اور نیکی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ۔" دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے سامان مجھے میسر ہیں ۔ مجھے عزت چاہیئے لیکن آپ کی ہو کر مجھے وہ عزت کہاں نصیب ہوگی ! لوگ مجھے "آوارہ" اور "شرابی" کی بیوی سمجھیں گے ۔ آپ ہی بتایئے، کیوں آپ سے شادی کریں ؟؟"

باغی

چاروں طرف سے اسے مبارک باد مل رہی تھی۔ آج وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونے جا رہی تھی۔ آج رضیہ اس کی بیٹی اپنے گھر کی ہونے جا رہی تھی۔

رضیہ اس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتی۔ اس کی ہر ادا پہ اپنا سب کچھ وار دینا چاہتی تھی۔ رضیہ کے ساتھ گذارا ہوا ایک ایک لمحہ اسے یاد تھا۔ ہر لمحہ اسے ایک نئی خوشی نئی راحت دے گیا تھا۔ اسے وہ دور بھی یاد تھا جب رضیہ کی پیدائش کے وقت اسے سہنا پڑا تھا۔ کتنا میٹھا میٹھا، پیارا پیارا درد تھا۔ جان نکلی جا رہی تھی تکلیف کے مارے لیکن پورا جسم ایک نئے سرور سے کانپ رہا تھا۔ ماں بننے کی خوشی سے لرز رہا تھا۔

جب اس نے پہلی بار رضیہ کو گود لیا تب اسے محسوس ہوا کہ سارے جہان کا سکھ میسر ہو گیا۔ جب رضیہ نے اپنے نازک نازک ہونٹوں کو اس کے سینے سے لگایا تو اس کی آرزوئیں مسکرا اٹھیں۔ ہر پیاس بجھ گئی۔ گویا زندگی کی ساری تمناؤں اور ساری لگن کا نام رضیہ پڑ گیا۔

وقت گذرتا گیا۔ رضیہ بڑی ہوتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ اور یہاں تک بڑھ گئی کہ لوگوں کی نگاہ اس پر ٹھہرنے لگی۔ وہ خود رضیہ کو دیکھتی اور مسکرا پڑتی۔ لمبا قد، سڈول جسم۔ کنول سی آنکھیں، پھول سے رخسار، گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ خدا نے اس کو بنانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس کا حسن دیکھ کر وہ اس کے حسن سے مطمئن تھی۔ اسے علم تھا کہ عورت کا سرمایہ اس کا حسن ہے۔

انھیں دنوں اس کے یہاں راشد آیا۔ راشد اس کی چچازاد بہن کا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کے والدین دیہات میں رہتے تھے۔ اس لئے اسے اس کے یہاں بھیج دیا تھا۔

رضیہ اور راشد قریب آتے گئے پہلے اس نے سمجھا کہ دونوں ہم عمر ہیں اسی لئے ساتھ رہتے ہیں لیکن جب دونوں کی دیوانگی بڑھی تو اسے ہوش آیا۔ اس کے خیال میں راشد رضیہ کے قابل نہیں تھا۔ رضیہ کے لئے ایک سے ایک نسبت آئی ہوئی تھی، کوئی آئی اے ایس تھا اور کوئی انجینئر۔ کسی لڑکے کے والد جج تھے۔ کسی کے کامیاب بزنس مین اور کسی کے بہت بڑے آفیسر تھے۔ ان سب کے سامنے راشد کچھ نہ تھا راشد انگلش میں ایم اے کر رہا تھا۔ اور اس کے باپ اسکول ماسٹر تھے۔ راشد کے مقابلہ میں رضیہ بہت بہتر تھی۔

اس نے رضیہ کی نسبت منظور احمد جج کے بیٹے منصور احمد آئی اے ایس سے طے کر دی۔ رضیہ کو جب علم ہوا تو وہ روئی، چیخی، تڑپی مگر کر ہی کیا سکتی تھی رضیہ کی چاہت کا علم اس کے باپ کو ہو گیا۔

باپ نے رضیہ کی ماں کو بہت سمجھایا کہ رضیہ کی خواہش پوری کر دی جائے

کیونکہ رضیہ کی خوشی اس کی خواہش کی تکمیل ہی میں ہے۔ اگر اس کی آرزو پوری نہ ہوئی تو ساری زندگی وہ تڑپ تڑپ کر گزارے گی۔ لیکن وہ نہ مانی۔

اس کا کہنا تھا کہ رضیہ کمسن ہے۔ ناسمجھ ہے۔ بچہ آگ کو پکڑنا چاہتا ہے تو کیا ماں اسے پکڑنے دیتی ہے؟ وہ رضیہ کی خواہش کیسے پوری کرے! بچہ دوسرا کھلونا پاکر بہل جاتا ہے۔ رضیہ بھی راشد کے بجائے منصور کو پاکر بہل جائے گی۔ زندگی آرام وسکون چاہتی ہے اور سکون دولت سے خریدا جاسکتا ہے۔ بھوکا پیٹ ننگا جسم صرف محبت کے سوال سے تسکین نہیں پاسکتا۔ رضیہ کے ابا ہار گئے۔

رضیہ روتی رہی، سسکتی رہی لیکن اس نے اپنے کان بند کر لیے۔ آنکھیں بند کر لیں کیونکہ اس میں رضیہ کا فائدہ تھا۔

آخر بارات کا دن آ گیا۔ رضیہ کی تڑپ نے غیروں کا دل ہلا دیا۔ اس کے آنسوؤں نے دوسروں کو رلا دیا۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ساری لڑکیاں اسی طرح روتی تڑپتی دوسروں کی ہو جاتی ہیں۔ اسے اپنا ماضی اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے بھی شادی سے پہلے کسی کو چاہا تھا۔ کسی سے پیار کیا تھا۔ ریاض اس کا چچازاد بھائی، اس کا محبوب، اس کا دیوتا، اس کا پجاری تھا مگر دولت مند نہ تھا۔

اس کے والدین اس کی زندگی میں سکھ اور چین چاہتے تھے۔ اور انھوں نے اس کی خواہش کے خلاف اس کی شادی ڈاکٹر انور سے کر دی اور انور کے ساتھ وہ خوش تھی۔ شادی کے بعد اسے کبھی ریاض کی یاد نہیں آئی۔

رضیہ کو وہ یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اس نے اسے بار ہا سمجھایا کہ ماں باپ جو کچھ کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔ دنیا میں ننانوے فیصد شادیاں اسی طرح ہوتی

ہیں لیکن بعد میں ہر لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہتی ہے۔ رضیہ کچھ نہیں سمجھتی صرف روئے چلی جاتی گویا وہ اپنی ماں کی بات نہیں سمجھ پاتی تھی۔

رضیہ کے باپ کو ایک خوف اور تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں رضیہ نکاح کے وقت انکار نہ کر دے۔ پھر بھی اسے اطمینان تھا کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کس میں ہمت ہے کہ سماج کے بنائے ہوئے قانون کو سماج کے سامنے توڑ دے نکاح سے پہلے بہت سی لڑکیاں اپنے حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں لیکن نکاح کے وقت سماج کا خوفناک چہرہ انہیں "ہاں" کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود اس نے بھی نکاح کے وقت انکار کرنا چاہا تھا۔ لیکن اپنی بے عزتی کے خوف سے "نہیں" نہ کہہ سکی۔

وہ بالکل مطمئن تھی۔ اسے علم تھا کہ ایسے قصے تو روز ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ وقت صرف تاریخ کو دہرا رہا تھا۔

نکاح کا وقت آگیا۔ وہ لوگوں سے مبارکباد لیتی ہوئی رضیہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ رضیہ شہانا جوڑا پہنے بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے رضیہ کا شانہ ہلایا "اٹھو بیٹی!!" رضیہ کی جدائی کے خیال سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ لیکن رضیہ نہ اٹھی۔ اس نے دوبارہ پکارا اور پکارتی چلی گئی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ آخر اس نے رضیہ کو جھنجھوڑ دیا۔ رضیہ نہیں جاگی۔ تکیہ کے نیچے زہر کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔

رات ہولے ہولے دھیرے دھیرے گذر رہی ہے۔ میرے پاس نازلی بے خبر سو رہی ہے۔ اس کے سانولے سلونے چہرے کو اطمینان اور سکون کے نور نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے دنیا کا کوئی غم نہیں ملا ہے ــــ اور میں کبھی چین کی نیند نہیں سو سکا۔ جب سے ہوش سنبھالا، اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، اپنا سکھ چین، اپنی نیند سب کچھ گنوا دیا ــــ نازلی کی چمکتی ہوئی پیشانی پر اس کے بکھرے بال کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ میرے ہاتھ خود بخود ان بالوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں انہیں چھونا چاہتا ہوں، چومنا چاہتا ہوں لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

نازلی نے بارہا شکایت کی ہے کہ جب میں اسے پیار کرتا ہوں اپنے سے قریب کرتا ہوں تو اسے پیار کے بجائے فرض کا احساس ہوتا ہے ــــ شاید نازلی سچ کہتی ہے۔ مجھے نازلی اچھی لگتی ہے، مجھے اس سے ہمدردی ہے ــــ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتا لیکن ان ساری باتوں، ساری سوچوں کے باوجود میں اس سے پیار نہیں کرتا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک بہت ہی نازک سی دیوار

ہے جس کی بنیاد بہت گہری، بہت مضبوط ہے ——— شمو ———

شمو جو آج کل اپنے شوہر کے ساتھ میرے پڑوس میں رہتی ہے، جو میری بیوی نازلی کی سہیلی ہے ——— جو میرے بچپن کی ساتھی، میری جوانی کا خواب، میری زندگی کی ماحصل ہے۔ جس کے فراق میں میں آج بھی تڑپتا ہوں۔ جس کے بغیر مجھے دنیا کا سارا حسن پھیکا پھیکا نظر آتا ہے ——— یہ چاند تارے بے نور سے لگتے ہیں۔

شمو جو نازلی اور میرے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوئی ہے۔ میں جب بھی نازلی کی طرف جھکتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے شمو مجھ سے پوچھ رہی ہے ——— "یہی ایفائے عہد وفا ہے؟" اور میں دل تھام کر رہ جاتا ہوں۔

نازلی ابھی روتے روتے سوئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ میں جب اسے روتا دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا سارا آنسو پی جاؤں ——— اس کی راہوں سے سارے کانٹے چن لوں لیکن اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ میری یہ ضدی فطرت مجھے ہی نہیں، نازلی کو بھی تباہ کر رہی ہے۔

نازلی میری خاموشی، میری اداسی کا راز جاننا چاہتی ہے اور نازلی جو کچھ جاننا چاہتی ہے، میں اسے کبھی نہیں بتا سکتا لیکن جو کچھ نازلی کو نہیں بتا سکتا، انہیں خود کبھی نہیں فراموش کر سکتا۔ انہیں یادوں کے سہارے میں زندہ ہوں، انہیں بھولنے کے بعد میرے پاس رہ کیا جائے گا؟!

نن پورہ، میرا آبائی گاؤں، مجھے آج بھی یاد ہے، حالانکہ اسے چھوڑے ہوئے بیسوں برس ہو گئے۔ نن پورہ میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی ———

میرے دادا ابا کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں زندگی کی عام ضرورتوں کی ساری چیزیں

مل جاتی تھیں۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا، جنگ آزادی جاری تھی۔ کانگریس گاندھی جی کی رہبری میں انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ابا کانگریس میں شامل ہو گئے۔

ابا کو کانگریس میں شامل ہونے کا سبب صرف جذبۂ حب وطن ہی نہیں تھا بلکہ ایک اور بات تھی ــــ ابا تعلیم یافتہ تھے، اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، خوش شکل اور خوش مزاج تھے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ابا شمو کے ابا کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے کیوں کہ وہ ابا سے برتر تھے۔ میرے ابا انصاری تھے، جولاہا تھے، وہ سید تھے، آل رسول تھے ــــ وہ زمیندار تھے، ابا رعیت!!

کانگریس جس دور کا خواب دیکھ رہی تھی، جس زمانے کا وعدہ کر رہی تھی، اس دور، اس زمانے میں کوئی بھی برتر نہیں رہے گا، اس کے راج میں سبھی برابر ہوں گے اور ابا اسی لیے اس میں شامل ہو گئے تھے۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ رسول اللہ نے اپنے ماننے والوں کو مساوات اور برابری کا پیغام دیا تھا اور انہیں کے ماننے والے اسی مساوات کو حاصل کرنے کیلئے دوسروں کا سہارا لینے لگے۔

جنگ آزادی بڑھتی گئی۔ کانگریس ترقی کرتی گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد ڈال دی اور اس پارٹی کا نام مسلم لیگ تھا ــــ شمو کے ابا اور ان کے دوسرے رشتہ دار اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔

دلوں میں چھپی ہوئی دشمنی، مختلف نظریات کا سہارا لے کر سامنے آگئی ــــ وہ لوگ جو قدموں سے دبائے جا رہے تھے، کچلے جا رہے تھے، انتقام کی آگ میں جل اٹھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جنہوں نے سدا حکومت کی تھی ــــ جس

کے دل و دماغ میں یہ خیال رچا بسا تھا کہ وہ اعلیٰ ہیں، برتر ہیں۔ جنہیں اپنے اقتدار سے پیار تھا اور وہ اس اقتدار، اس بلندی اور اس عزت کی حفاظت کے لئے برسرِ پیکار نظر آنے لگے۔

ادھر نبرنگ ایک دوسرے کی نفرت میں جل رہے تھے اور ادھر بچے سب باتوں سے بے نیاز ایک دوسرے کا دم بھر رہے تھے —— وہ نہیں جانتے تھے کہ چھوٹا کون ہے اور بڑا کون؟ ہر فرق کو بھولے ہوئے، ہر اختلاف کو فراموش کئے ہوئے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ انہیں بچوں میں شمو اور منا بھی تھا۔

"کیا بات ہے، نازلی، آج کچھ اداس ہو؟" ریاض نے پوچھا

"آج منا کی تیسری سالگرہ ہے اور میں اس سے کتنی دور ہوں ——"

"ہاں مجھے بھی منا بہت یاد آ رہا ہے —— کیسی پیاری پیاری شرارتیں کرتا ہے" ریاض نے کہا۔

نازلی خاموش رہی۔ منا، اس کا بیٹا، اس سے دور اپنی دادی کے گود میں پروان چڑھ رہا تھا۔ ریاض اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اماں اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں لیکن نوکری کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ ریاض پہلے پٹنہ میں کام کرتا تھا لیکن دو سال قبل اس کا تبادلہ کلکتہ میں ہو گیا تھا۔ کلکتہ آتے وقت ریاض نے اپنے بچے کو اماں کو اپنی جگہ دے دیا —— اماں کی تنہائی دور ہو گئی۔

نازلی کے درد کا احساس کس کو نہیں ہوا۔ نازلی کو اگر ریاض کی محبت حاصل ہوتی تو اسے منا کی یاد شاید نہیں ستاتی۔ لیکن یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ ریاض کی موجودگی

تب بھی اس کی تنہائی نہیں دور ہو پاتی تھی۔ ریاض کو اپنی سوخ، اپنی فکر سے کبھی فرصت نہیں ملتی کہ اس کی طرف دیکھے اور اس تنہائی کے عالم میں اسے مناہت یاد آتا۔

ریاض نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"اگر دل بہت گبھراتا ہے تو چلو ایک ہفتہ کی چھٹی لئے لیتا ہوں۔ مناکو دیکھ آئیں گے"

"کب تک چھٹی لیجئے گا؟" وہ خاموش ہو گئی۔

"جب کہو۔ ہاں، تمہاری دوست، مسز ناصر کو کتنے بچے ہیں؟"

"شمو بدنصیب ہے۔ شادی کو دس سال ہونے کو آئے، ابھی تک گود نہیں بھری۔"

نازلی مکمل عورت تھی۔

"گھر میں کون کون رہتا ہے؟"

"دونوں میاں بیوی، بوا اور عنبر۔"

"عنبر کون؟؟" وہ چونکا۔

نازلی نے محسوس کیا کہ ریاض اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہوتے جا رہا ہے۔ اس نے ریاض کو اپنی طرف مخاطب رکھنے کیلئے جلدی سے جواب دیا۔

"عنبر۔ ان کا نوکر، بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ عمر بھی کوئی دس بارہ سال ہو گی۔ شمو اسے بہت مانتی ہے لیکن ڈاکٹر ناصر اس سے خوش نہیں رہتے شاید عقل کا بالکل کورا ہے۔ بوا بھی ناراض رہتی ہے۔"

نازلی بولتی چلی گئی لیکن ریاض شاید کچھ بھی نہیں سن سکا۔

"عنبر! عنبر!" یہ نام اس کے دماغ میں گونجتا رہا۔ اس کا دل و دماغ سن ہوتا چلا گیا۔ وہ کہیں اور تھا، کسی خیال، کسی فکر میں الجھا ہوا۔

نازلی نے اس کی خاموشی دیکھی اور چکرا کر رہ گئی کہ یہ کیا ہوا؟؟

نازلی گھبر گئی ہوئی ہے۔ منا کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ اس قدر بے چین ہوئی کہ مجھے اسے تنہا بھیجنا پڑا۔ مجھے چھٹی نہیں مل سکی ویسے میں خود پٹنہ نہیں جانا چاہتا۔ پٹنہ کے در و دیوار، گلی سڑکیں، بازار سب مجھے میرے ماضی کی داستان دہراتے نظر آتے ہیں۔ اور مجھے اپنے ماضی سے وحشت ہوتی ہے۔ لیکن کیا پٹنہ سے دور کلکتہ آکر میں اپنے ماضی کو بھول گیا ہوں؟ میری زندگی کا کون سا لمحہ ایسا ہے جب مجھے اپنا ماضی نہیں یاد آتا؟ مجھے شمو کا خیال نہیں آتا ہے؟

شمو اور میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے پروان چڑھتے رہے اور دوسری طرف ہمارے والدین ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔

مجھے اپنے بچپن کا وہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا جب مجھے پہلی بار اپنی زندگی میں ذلت کا احساس ہوا تھا۔ شمو کے یہاں کسی کی شادی تھی۔ دعوت نامہ ہم لوگوں کے یہاں بھی آیا تھا۔ یوں بھی میرے دیہات میں یہ رواج تھا کہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں سارے لوگ شریک ہوتے تھے۔

دادی اماں اور اماں کے ساتھ میں بھی شمو کے یہاں گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کھانا چن دیا گیا اور عورتیں کھانے پر لے جائی جا رہی ہیں۔ کھانے کے پہلے

توڑ پر جو عورتیں لے جائی گئیں وہ اماں، دادی اماں اور انہیں جیسی دوسری عورتیں تھیں۔ میرے کان میں اپنی اماں کی آواز آئی، وہ شمو کی اماں سے کہہ رہی تھیں۔
"بہن ہم لوگ بعد میں کھالیں گے، پہلے مہمانوں کو کھلایئے۔"
شمو کی اماں نے کہا "وہ لوگ گھر کی ہیں۔"
اماں نے جواب دیا "میں کب باہر کی ہوں۔ وہ لوگ باہر سے آئی ہیں، ہم لوگ ایک گاؤں کے ہیں۔ انہیں کھانے پر لے چلئے۔ ہم لوگ آپ کے ساتھ کھائیں گے۔"
میرے کان سے شمو کی دادی اماں کی زہر بھری آواز ٹکرائی "اب مینڈک کو بھی زکام ہو چلا ہے۔ کہاں وہ بہو اور کہاں یہ؟ دونوں ساتھ کھائیں گی۔"
ان کا یہ کہنا تھا کہ ساری محفل کی نگاہیں ہم لوگ کی طرف اٹھ گئیں۔ ان نگاہوں میں کتنی تضحیک تھی، میں آج بھی نہیں بھول سکا ہوں۔ اماں اور دادی اماں بغیر کھانا کھائے، لوٹ آئیں۔
ان باتوں کی خبر مردوں تک پہنچی۔ پنچایت بیٹھی اور فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اب ان لوگوں کے کسی خوشی اور غمی میں شریک نہیں ہوں گے۔ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔
جب ان لوگوں کو اس فیصلہ کی خبر ملی تو وہ لوگ ہنسے۔ انہیں اپنی دولت، اپنی شان و شوکت پر ناز تھا، غرور تھا۔ انہیں علم تھا کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے لیکن وہ یہ بھول رہے تھے کہ وقت پلٹ رہا ہے۔ دولت اب صرف ان تک ہی محدود رہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی حاصل ہو گئی۔ جس

شان وشوکت پر انہیں ناز تھا، وہ ماضی کی داستان بنتی جارہی تھی۔

انہیں دنوں سمّو کے نانا ابا کا انتقال ہوگیا۔ جب ان کی آخری منزل کا انتظام کرنے کے لیے غسال، گورکن اور درزی کو بلایا گیا تو کوئی بھی حاضر نہیں ہوا۔ سمّو کے ابا گرجتے رہے، بگڑتے رہے۔ مولوی شیخ نظیرالدین خدا کا خوف دلاتے رہے لیکن گاؤں کا وہ طبقہ جو ذلیل تھا، رذیل تھا، اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہا۔

آخر ہار کر سمّو کے ابا نے آس پاس کے گاؤں والوں کو بلوایا لیکن ان لوگوں کا جواب تھا کہ جب تک آپ کے گاؤں والے ہمیں اجازت نہیں دیں گے ہم نہیں آسکتے ہیں۔

مجبوراً دوسرے دن سمّو کے ابا میرے دادا ابا کے پاس آئے۔ ان لوگوں میں نہ جانے کیا باتیں ہوئیں لیکن جب سمّو کے ابا دادا ابا کے پاس سے واپس آئے تو میں نے دیکھا سمّو کے ابا کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ ابا اور چچا ابا ان کے ساتھ سر اٹھائے چل رہے ہیں ان لوگوں کے لبوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ وہ مسکراہٹ جو اس شخص کے لب پر آتی ہے جو جیت جاتا ہے۔

شام تک سمّو کے نانا ابا اپنی آخری منزل کو پہنچ گئے۔ لیکن دلوں کے زخم اور گہرے ہوگئے۔ گاؤں کا وہ طبقہ جو اب تک بلند اور باعزت تھا اس نے محسوس کیا کہ اب گاؤں میں رہنا اپنے کو ذلیل کرنا ہے۔ جس پر کبھی حکومت کی ہے انہیں کے ہاتھوں چوٹ کھانا ہے اور وہ لوگ آہستہ آہستہ اپنا وطن چھوڑنے

لگے۔گاؤں ویران ہونے لگا۔

اسی درمیان ہندوستان آزاد ہوگیا، منقسم ہوگیا۔ مسلمانوں کو پاکستان لے جانے کے لئے ٹرینیں چلنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے سارا گاؤں ویران ہوگیا۔ پندرہ بیس گھروں کو چھوڑ کر سارے لوگ پاکستان چلے گئے۔ جو لوگ رہ گئے ان میں میرا خاندان اور شمو کے لوگ بھی تھے۔ لیکن اب شمو کے ابا اور ان کے لوگوں کا زوال شروع ہوچکا تھا۔ پورے ہندوستان پر کانگریس کا قبضہ تھا۔ اس لئے میرے گاؤں میں بھی ابا کا طوطی بول رہا تھا۔

قسمت شمو کے ابا پر کچھ اور وار کرنے کو تلی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد حکومت نے قانون کے ذریعہ زمینداری بھی چھین لی۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ عزت، دولت، شان وشوکت سب وقت کی نذر ہوگیا۔ تب ان کی آنکھ کھلی — انہوں نے وقت کی آواز کو پہچانا اور کانگریس میں شامل ہوگئے۔

انہیں دنوں سارے ملک میں انتخاب ہوا اور ابا کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے منتخب ہوگئے۔

ہم لوگ پٹنہ آگئے — دادا ابا نے دیہات میں رہنا پسند کیا۔

آج ایک ساتھ نازلی کے دو خط آئے ہیں۔ نازلی کی محبت اور بے قراری پر پیار آجاتا ہے۔ لیکن یہ پیار کہاں سے لاؤں میں اپنی ساری چاہت، اپنا سارا پیار کسی اور کے قدموں پر لٹا چکا ہوں۔ میرا دل تو بالکل خالی ہے۔ میں خود اپنی چاہت اور اپنے پیار کے لئے ترس رہا ہوں۔

وہ دن بھی کیا دن تھے۔ جب میں شمو کی محبت میں سرشار سارے جہان کو بھولے بیٹھا تھا۔ مجھے ساری دنیا صرف ایک محور کے گرد چکر کاٹتی ہوئی نظر آتی تھی اور وہ "محور" شمو تھی ــــ میری شمو !!

ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ ماضی کی روایتیں بدل چکی تھیں۔ نئے ہندوستان کے پاس نئی امیدیں اور نئی چاہتیں تھیں ــــ نئے تصور اور نئے خواب تھے لیکن ہندوستان والوں کا دل نہیں بدلا تھا۔ ان کے دلوں میں وہی نفرت، وہی اونچ نیچ کے زہر بھرے تھے۔ شراب وہی تھی صرف پیمانے بدلے تھے۔

ابا اور شمو کے ابا بہار اسمبلی میں کانگریس کے ممبر تھے۔ لیکن ان کے درمیان جو نفرت اور حسد تھی وہ اب بھی برقرار تھی۔ دونوں پردے کے پیچھے سے اپنی اپنی ذات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کو لڑا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کمزور مسلمان جنہیں اتحاد اور محبت کی طاقت کی ضرورت تھی وہ آپس کی جنگ کے سبب اور کمزور ہو رہے تھے۔ لیکن ابا اور شمو کے ابا کو اپنی جھوٹی عزت کے سوا اور کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔

دوسری طرف نئی نسل والوں کے پاس نئے ہندوستان کے خواب تھے انہیں ایک متحد مضبوط اور خوشحال ہندوستان کی چاہ تھی۔ اور اسی تصور کے سہارے نئی زندگی میں قدم رکھ رہے تھے۔

انہیں لوگوں میں شمو اور میں تھا۔

بہت دنوں بعد جب میں نے شمو کو اپنے ساتھ ایم۔ اے۔ کے کلاس میں دیکھا تو چکرا کر رہ گیا۔ کیا وہی شمو ہے ؟ میرے دل کے گوشے سے یہ آواز ابھری۔

ہاں، یہی وہی شمو تھی ۔۔۔ لمبا سرو قد، گلابی رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں لمبے لمبے گھنے سجیلے بال، پتلی کمر، سرخ ہونٹ ۔۔۔

کچھ دنوں بعد ہماری چاہت، ہماری محبت کے انسانے کالج کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ یونیورسٹی سے ہوتے ہوئے سارے شہر کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ ہمارے نام کے ساتھ ایک دوسرے کا نام پکارا جانے لگا۔

بات پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ہمارے والدین کو خبر ہو گئی۔ ان کی آپس کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف زور شور سے نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔

شمو کے ابا کو یہ احساس مارے ڈالے رہا تھا کہ ان کی بلند و بالا ذات پر ایک نیچ قوم کا سایہ پڑ رہا ہے۔

میرے ابا نو دولتیے تھے۔ ان کو اپنی نئی نئی دولت اور عزت پر بہت غرور تھا۔

کاش ہم دونوں اپنے والدین کو سمجھ سکتے۔ کاش ہمیں احساس ہوتا کہ ہمارے اصل دشمن ہمارے والدین ہیں۔ جنہیں ہم سے زیادہ، خود سے محبت ہے ۔۔۔

آج عنبر نے شمو کا خط لا کر دیا ہے۔ میں عنبر کو دیکھتا رہ گیا۔ عنبر کو دیکھ کر مجھے اپنے دادا ابا کی شکل یاد آئی ۔۔ سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھ اور بلند پیشانی۔

شمو نے لکھا ہے کہ عنبر کا مستقبل روشن چاہتی ہے۔ عنبر کو خوشیوں سے ہمکنار دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ یہ سب نہیں دے سکتی کیوں کہ ناصر کہتے ہیں کہ جب

خدا نے اپنا بچہ نہیں دیا تو دوسرے کا بچہ کیوں پالیں۔ اگر پالنا ہے تو اپنے خاندان کا بچہ گود لیں ۔۔۔ یا اس نالی کے کیڑے کو ۔۔۔

عنبر ۔۔۔ اپنا بچہ ۔۔۔ نالی کا کیڑا ۔۔۔ یہ سب کیا ہے ؟؟

میرے اللہ ! تو بتا میں کیا کروں ؟ کہاں سے صبر لاؤں ؟؟ معاف کر دے اللہ ! اب میرے گناہ کو معاف کر دے !!

شمو تمہیں یاد ہے، جب تمہارے ابا کو ہمارے پیار کی خبر ہوئی تو انہوں نے تمہیں کالج سے اٹھا لیا ۔۔۔ تمہارے اوپر طرح طرح کی سختیاں کی جانے لگیں۔ تمہارے خط سنسر ہونے لگے ۔۔۔ تمہارے چاروں طرف دیواریں چن دی گئیں۔ تمہارے پاس تمہارے والدین کی اجازت کے بغیر باہر کی ہوا بھی نہیں آسکتی تھی۔

انہیں دنوں تمہارے دادا ابا کی طبیعت خراب ہوئی اور تم لوگ دادا ابا کے پاس پہنچ گیا۔

ایک رات جب میں تمہاری یاد سے بے چین اور بے قرار تھا، میں نے دیکھا کہ میرے کمرے میں چاند اتر آیا ہے ۔۔۔ تم میرے پاس تھیں۔

ایک عرصہ کے بعد دو چاہنے والے ملے تھے۔ بہت دنوں بعد محبت آزاد ہوئی تھی ۔۔۔ ہم سب کچھ بھول گئے ۔۔۔ خدا کو فراموش کر دیا ۔۔۔ زمانہ سے تھوڑی دیر کے لئے کنارہ کش ہو گئے، ہم ایک ہو گئے ۔۔۔ !!

جب ہوش آیا تو رات بیت چکی تھی۔ ہم گناہگار تھے ۔۔۔ زمانے ہی کے نہیں، خدا کے بھی ۔۔۔ ہماری نگاہیں اپنے گناہ کے خیال سے جھکی ہوئی تھیں اور ہمارا ضمیر ہمارے دل پر تازیانہ لگا رہا تھا۔

لوٹ گئیں لیکن میرا چین سدا کے لئے چھن گیا۔ میں نے کبھی تمہیں برباد کرنا نہیں چاہا تھا۔ مجھے اپنی پاک اور صاف محبت پر ناز تھا۔ لیکن اب افسوس کرنے سے بھی کیا فائدہ تھا۔ شیطان اپنا کام کر چکا تھا۔

کچھ مہینوں بعد گھر کی عورتوں کی سرگوشیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ تم ماں بننے والی ہو۔ تمہاری بے بسی، تمہاری مجبوری لگا ہوں میں پھر گئی اور میں نے ابا سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم سے شادی کروں گا یا خودکشی۔ ابا بگڑے، گرجے لیکن ہار گئے۔

اماں تمہارے یہاں پیغام لے کر گئیں۔ تمہاری اماں روتے ہوئے ان سے لپٹ گئیں لیکن تمہارے ابا نے اپنی ضد نہیں چھوڑی۔

کچھ دنوں بعد تم نینی تال چلی گئیں۔ سنا ہے وہاں تمہیں بیٹا پیدا ہوا اور تمہارے بیٹے کو ہمارے گاؤں کی ایک دایا کو دے دیا گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تم سے ملوں، بچہ کو دیکھوں لیکن اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہا۔

وقت گذرتا گیا۔ تمہاری شادی ہوگئی اور اس کے بعد میری زندگی میں نازلی آگئی۔

زندگی کے دن کٹتے گئے لیکن آج تم نے اس زندگی کے دوراہا پر عنبر کو لاکر کھڑا کر دیا۔ تم نے نہیں لکھا ہے کہ عنبر کون ہے لیکن یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے عنبر کی شکل ہی یہ بتانے کو کافی ہے کہ وہ میرا بچہ ہے، ہمارا بیٹا ہے۔

لیکن شمو، میں عنبر کو کیوں کر قبول لوں، کیسے اپناؤں!!

اگر ناصر عنبر کو گود لینے کو نہیں تیار ہیں تو کیا نازلی تیار ہو جائے گی۔

نازلی، جس کے گود میں اپنا بیٹا ہے وہ اپنے بیٹے کا حق کسی دوسرے کے بیٹے کو کیوں دے گی ـــ تمہیں بتاؤ، جب وہ پوچھے گی عنبر کون ہے، تو میں کیا جواب دوں گا ؟ !

میری جان، مجھے راستہ دکھاؤ ـــ میں بھی عنبر کو سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یقین کرو جان !!

آج صبح یک بیک نازلی آگئی۔ اس کے ساتھ میرا چچازاد بھائی شبیر تھا نازلی نے بتایا کہ میرا خط نہ پانے پر وہ گھبرا گئی تھی۔ اس لیئے ضد کر کے آگئی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی لیکن شبیر اس کی حالت بتا بتا کر چھیڑتا رہا۔ میرا فراق، میرا ہجر اس کے لیئے کتنا جانگسل ہوتا ہے، شبیر ہنس ہنس کر سناتا چلا گیا۔ جب شبیر نہانے چلا گیا تو میں نے اس کے شانہ پر اپنا سر ٹیک دیا۔ وہ پیار سے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ مجھ سے اس کا پیار، اس کی چاہت نہیں دیکھی گئی۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کر تڑپ اٹھا۔ نازلی، مجھ سے اتنا پیار نہ کرو ـــ میں اس لائق نہیں ہوں ـــ نازلی کیوں ایک پتھر سے سر ٹکرا رہی ہو ـــ

شمع کے خط روز آتے ہیں ان میں سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پیار کا ذکر کرتی ہے، اپنے شوہر پہ ناز کرتی ہے، کبھی میرے پیار کی خلش اسے تڑپاتی ہے اور کبھی عنبر کا مستقبل اسے بے چین کر دیتا ہے ـــ

اب وہ ناصر کے ساتھ لندن جا رہی ہے۔ اس کا ارادہ عنبر کو نازلی کے پاس دیکھنے کا ہے نازلی ہمیشہ نوکری کی تلاش میں رہتی ہے عنبر کو پا کر تو خوش ہو جائے گی ـــ لیکن میں ؟ ؟

آج نازلی بہت اداس ہے۔ اس کی سہیلی شمو چلی گئی۔ مجھے نازلی کی معصومیت پر ہنسی آتی ہے۔ وہ شمو کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔ اس شمو کو جس کے سبب سے، اس کا ریاض اس کا نہ ہو سکا۔

عنبر نازلی کے پاس ہے۔ نازلی اس سے گھر کا سارا کام لیتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جھاڑو دیتے ہیں، مسالہ پیستے ہیں، برتن اور کپڑا دھوتے ہیں۔ اس کو کھانے کے لیئے وہ ملتا ہے، جو میرے کھانے سے بچ جاتا ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں اور خاموش رہ جاتا ہوں۔ کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن دل کا چور زبان پکڑ لیتا ہے۔

ایک بار اس کے لئے بہت قیمتی شرٹ لے آیا تو نازلی نے اسے میرے چچازاد بھائی کے بیٹے کو بھیج دیا۔

میرے اللہ! میں کیا کروں۔ عنبر کو اپنے گناہ کی سزا کیوں بھگتنے دوں؟ یہ ساری چیزیں، یہ سارا گھر میرا ہے یعنی عنبر کا ہے۔ عنبر میرا بیٹا ہے پھر وہ ان سب چیزوں کا مالک کیوں نہیں ہے؟ نازلی جب اس پر سختیاں کرتی ہے اور میں کچھ بولتا ہوں تو نازلی مجھ سے روٹھ جاتی ہے۔ مجھ سے نازلی کی خفگی بھی نہیں دیکھی جاتی۔

میں نے ایک بار اسے پڑھانے کی کوشش کی لیکن نازلی اس کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس کی طرف میرا جھکاؤ نازلی کو پسند نہیں ہے۔

لیکن میرے سینے میں جو باپ کا دل دھڑکتا ہے، اسے کیا کروں؟؟

ربو !!

تم پوچھتی ہو، یہ کیسے ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ خود میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ سب یہ کیا ہوا؟

ایک خط میں تمہیں میں نے اپنے نئے نوکر عنبر کے بارے میں لکھا تھا کہ ریاض اس سے شدید محبت کرتے ہیں۔ عنبر کی چاہت میں وہ مجھے بھولے جا رہے ہیں۔ اس محبت کا سبب مجھے معلوم نہیں تھا لیکن ایک دن یہ راز مجھ پر کھل گیا۔ مجھے ان کی کتابوں کی الماری میں کچھ خط ملے۔

یہ خط ان کے نام تھے ۔۔۔ سمّو کے محبت نامے جس سے یہ بھی پتہ چلا کہ عنبر ان دونوں کی ناجائز اولاد ہے ۔۔۔ ان دنوں وہ کسی کام سے الہ آباد گئے ہوئے تھے۔

ربو! میرے سامنے منا کا مستقبل تھا۔ اپنی محبت تھی۔ میں ہفتوں سوچتی رہی اور ایک دن ان کے پیچھے میں نے عنبر کو اپنے پڑوس والوں کے ساتھ دوسرے شہر بھیج دیا۔

جب وہ لوٹے تو عنبر نہیں تھا۔ مجھ سے سب سے پہلے انہوں نے عنبر کی خیریت دریافت کی۔ میں نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا کہ وہ بھاگ گیا۔ اس وقت تک میں اپنے جذبوں پر قابو پا چکی تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان کو کبھی بھی پتہ نہیں چلنے دونگی کہ میں ان کا راز جانتی ہوں۔

لیکن عنبر کے بھاگنے کا سن کر وہ اپنے آپ میں نہیں رہے وہ ریاض جس نے

مجھ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی وہ مجھے غصہ میں سب کچھ کہتا چلا گیا ـــــ
حاسدی، بدمعاش، جھوٹی، مکار ـــــ ربو، یہ سب کچھ انہوں نے مجھے کہا
ـــــ ان کی آواز بھی بہت تیز تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے بہت دھیمے
سروں میں انہیں آواز دیا ـــــ "مجھے معلوم ہے کہ عنبر کون ہے؛ شمو کا خط میں
نے پڑھا ہے ـــــ"
میرا یہ کہنا تھا کہ وہ خاموش ہو گئے اور کچھ دیر بعد ان کی طبیعت بگڑنے
لگی۔ ڈاکٹر کے آتے آتے، وہ اس دنیا سے سدھار چکے تھے ـــــ ڈاکٹر کا
خیال ہے کہ ان کا دل پہلے سے کمزور تھا اور کسی گہرے صدمے نے اسے ہمیشہ
کے لئے بیٹھا دیا۔
اور ربو! میری دنیا سونی ہو گئی ـــــ منا کا مستقبل تباہ ہو گیا ـــــ
تمہاری "نازلی"

بہت دنوں بعد ناصر اور مسز ناصر لندن سے اپنے وطن کو لوٹتے ہیں۔
دونوں کو ہوڑہ ایکسپریس تیزی کے ساتھ ان کے گھر پٹنہ کی طرف لے جارہی
ہے۔
بردوان اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ ناصر چائے لانے کے لئے کمپارٹمنٹ
سے اتر کر باہر چلے گئے۔
شمو کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ چودہ
پندرہ سالہ لڑکے کو پولس کسی کا جیب کاٹنے کے جرم میں جیل لئے جارہی ہے۔

شکل جانی پہچانی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔

اسی درمیان ناصر آگئے ــــ ناصر اسے بتا رہے تھے،، تم نے پہچانا اس لڑکے کو ــــ وہ تمہارا لاڈلا عنبر تھا ــــ مجھے شروع سے وہ بدمعاش نظر آتا تھا ــــ انسان کا خون آخر رنگ لے ہی آتا ہے ــــ نالی کا کیڑا، نالی کا کیڑا ہی رہے گا ــــ،،

یہ نہ تھی ہماری قسمت

شانو ! آج نہ جانے کیوں تم بہت یاد آ رہی ہو ـــــ باہر بارش ہو رہی ہے۔ پیاسی زمین بارش کے قطروں کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ لیکن میری روح کی پیاس اور بڑھ گئی ہے، میرا بے قرار اور بے تاب دل بری طرح تڑپ رہا ہے۔ یہ تڑپ نہ جانے کب سے میرا مقدر بن چکی ہے ـــــ شاید اسی دن سے جب تم میری زندگی میں آئی تھیں۔

شانو، اس دن سے پہلے میں کتنا خوش و خرم رہتا تھا، تمہیں کیسے بتاؤں ؟ ان دنوں میرے پاس سب کچھ تھا۔ ماں باپ کا پیار بہنوں کی محبت، دوستوں کی چاہت، ہر آن نئی امنگ، ہر لمحہ نئی زندگی کا خواب، ہر ساعت اچھے مستقبل کی آس ـــــ اور ان سب سے بڑھ کر شاہی، میرے بچپن کی حسین ساتھی میری زندگی کا حاصل۔ لیکن ایک تمہارے نام نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا۔ مجھے دنیا کے سارے رشتوں سے نفرت ہو گئی۔ ہر امید ٹوٹ گئی۔ ہر آرزو مٹ گئی ہر خواب بکھر گیا۔ مستقبل سے خوف آنے لگا۔ میری اپنی شاہی میرے لئے غیر بن

گئی۔

ان دنوں جب میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا، میرے گھر والے بہت پریشان تھے۔ آپا کے ساتھ منو اور شبو بھی بڑی ہو چکی تھیں، لیکن شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اچھے لڑکے نہیں ملتے تھے، کیوں کہ تقسیم وطن کے بعد اچھے لڑکے باہر جا چکے تھے اور جو یہاں تھے، ان کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ ابا جب دس پندرہ ہزار کا ذکر سنتے تو سر جھکا لیتے۔ اسی اندھیرے عالم میں امید کی ایک کرن جگمگائی۔ آپا کے لئے تمہارے بھیا کے رشتے کا پیغام آیا۔ تمہارے بھیا انجینیر تھے، خوبصورت اور خوش مزاج تھے اور پھر پیسے کی مانگ بالکل نہیں تھی ——— لیکن شانو، تم لوگ اتنے فراخ دل بھی نہ تھے۔ اس رشتے کے صلہ میں تم ابا کے آخری سرمائے کے طلب گار تھے۔ ابا یہ سن کر چپ ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ تم ہی میری زندگی ہے۔ ایک کی زندگی بچانے کے لئے دوسرے کی زندگی لینا ان کے بس سے باہر تھا۔ ماں باپ کے لئے سب بچے برابر ہوتے ہیں۔

اب فیصلہ کرنا میرا کام تھا۔ ایک طرف میری آرزو اور تمنا تھی اور دوسری طرف آپا کے جوان جذبات اور فطری تقاضے تھے ——— وہ آپا جو مجھ پر جان چھڑکتی تھیں۔

کچھ دن بعد آپا کی شادی ہو گئی، اور ساتھ ہی میری بھی۔ تم دلہن بن کر میرے گھر آگئیں۔ مجھے وہ رات اب بھی یاد ہے، جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا ——— دنیا والوں کی نگاہ میں وہ رات میری زندگی کی حسین اور رنگین رات تھی لیکن میرے لئے زندگی کی سب سے تاریک گھڑی ——— ہم دونوں تنہا تھے ——— تم کیا سوچ رہی تھیں، کیا چاہ رہی تھیں، میں کہہ نہیں سکتا ——— لیکن شانو، میرے پاس کچھ بھی نہ تھا ——— نہ کوئی آرزو،

نہ تجسس، نہ خیال۔ میں خود کو اندر سے بالکل خالی محسوس کر رہا تھا، بلکہ ٹوٹا سا، لیکن فرض مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے تمہارا گھونگھٹ الٹ دیا —— ثنانو، مجھے آج بھی حیرت ہے کہ عورت جسے صنفِ لطیف کہتے ہیں، کیا اتنی بھدی بھی ہو سکتی ہے۔ —— بھاری، بے ڈول جسم، سیاہ رنگ، چیچک زدہ چہرہ —— خدایا! میں کس قدر بد نصیب ہوں، یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا اور جب نگاہ تمہارے چہرہ سے ہٹائی تو میں نے دیکھا کہ تمہارے پیچھے ثناہی کھڑی ہے —— اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ۔ میں دل تھام کر رہ گیا۔

دوسری صبح میں ثناہی کے پاس لوٹ گیا، اس ثناہی کے پاس جو میری منتظر تھی، جس کا سارے سنسار میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔

میری زندگی کچھ سنور گئی۔ لیکن جب میں گھر واپس آتا تو میری زندگی بجھ سی جاتی، تم میری منتظر جو رہتیں۔ ویسے تو میں ہر فرض نبھاتا چلا گیا —— تم سے باتیں کرتا، تمہارے ساتھ ہنستا۔ تمہاری فرمائشیں پوری کرتا —— لیکن میرا دل تمہارے پاس کبھی نہ لگتا۔ تم بھی شکوہ کرتی رہتیں۔ ان دنوں تم نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ میں جس قدر کھنچتا، تم اسی قدر بہکتی تھیں۔ میری ظاہرداری پر مسکرانے لگتیں —— لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب تمہاری محبت میں ٹھہراؤ آ گیا۔

ان دنوں میں اسی فرم میں کام کرتا تھا، جہاں ثناہی ٹائپسٹ تھی۔ اس لئے میرا بہت زیادہ وقت آفس میں گزرنے لگا اور آہستہ آہستہ تمہیں بھی سب کچھ معلوم ہو گیا۔

پھر ثنانو، تم بالکل بدل گئیں۔ ایک گھر میں رہ کر بھی تم نے مجھے فراموش کر دیا۔ تم شکوہ

کرنا بھول گئیں، اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور مجھ سے یک سر بے نیاز ہو گئیں۔ اب تم ہر وقت ہنستی رہتی تھیں جیسے تمہیں کوئی احساسِ غم نہ تھا۔

تم شاید بدلے لے رہی تھیں، لیکن مجھے پروا کب تھی؟ تم جیو یا مرو، مجھے کیا؟

اسی درمیان تمہاری صحت گرنے لگی۔ لیکن تم نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ تمہاری مرجھائی ہوئی صورت دیکھ کر مجھے تم پر ترس بھی آتا۔ خاص طور سے اس وقت جب تم مجھے اچھی لگنے لگتیں تھیں ـــــ ہاں، کبھی کبھی تم مجھے اچھی بھی لگتی تھیں۔ لیکن یہ کشش ایسی ہی تھی جیسی ایک مرد کو ایک عورت کے لئے محسوس ہوتی ہے ـــــ ایک ایسی کشش جس میں کوئی چاہت نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک ضرورت چھپی رہتی ہے۔

اسی زمانے میں میری زندگی میں جوار بھاٹا آنے لگا۔ باس کا لڑکا امریکہ سے لوٹ آیا تھا۔ شاہی کے حسن پر وہ مرمٹا تھا۔ لیکن شاہی کے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ شاہی میری تھی اور میرے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی دھن میں تھا۔ لیکن اس کی کوئی ترکیب کارگر نہیں ثابت ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں اندر ہی اندر خوف زدہ بھی تھا کہ کہیں وہ میری شاہی کو مجھ سے چھین نہ لے۔

ایک دن اچانک تمہاری حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر آیا۔ پتہ چلا کہ تم کینسر کی مریض ہو۔ اگر آپریشن نہیں ہوا تو تین مہینہ کے بعد تم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گی۔

انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ اس کا سن کر جو خیال مجھے سب سے پہلے آیا تھا وہ یہی تھا کہ اب صرف تین ماہ کا چکر ہے ـــــ تین ماہ بعد میں آزاد ہو جاؤں گا۔ آپریشن میرے لئے بالکل ناممکن سی بات تھی۔ آپریشن میں تین چار ہزار روپے کا صرفہ تھا اور میرے پاس چار پانچ سو روپے بھی نہ تھے۔

تھا لو، شاید انسان اپنی خوشی اور غم چھپا نہیں سکتا۔ تمہیں بھی میری خوشی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

وہ رات میں زندگی بھر نہیں فراموش کر سکوں گا جب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تم میری ہو، تمہاری زندگی، تمہارا سکھ، تمہارا دکھ، تمہاری خوشی، تمہارا غم، سب کچھ میرے لئے ہے۔ اس رات جب میں آنکھیں بند کئے آنے والے دنوں کے حسین خواب دیکھ رہا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی سسک رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ کون رو رہا ہے۔ — آدھی رات کو تمہارے سوا کون جاگ رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر میں نے صبر کیا لیکن تمہاری سسکیاں تیز ہوتی گئیں تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے آہستہ سے تمہارے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہنے کو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ تم میرے سینے سے آلگیں۔ روتی رہیں۔ آنسوؤں کے درمیان کہتی رہیں "میں جانتی ہوں، آپ بہت خوش ہیں۔ میں آپ کی راہ کا کانٹا تھی نا!"

میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا لیکن میں پھر بھی خاموش رہا۔ تم روتی رہیں۔ تمہاری آواز میرے کان میں زہر گھولتی گئی "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں — ابھی میں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔"

تم روتے روتے میری باہوں میں سو گئیں، لیکن میں ساری رات جاگتا رہا۔ تم بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ لیکن تمہارا آنسوؤں سے تر زرد چہرہ بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ تمہارے اس معصوم سے، پیارے سے وجود کو مجھے بچانا ہے۔ تمہیں زندہ رکھنا ہے — میرے دل کے ہر گوشے سے بس یہی صدا آنے لگی۔ تم بے گناہ ہو، بے خطا ہو۔ پھر تمہیں سزا کیوں ملے؟

رات گذر گئی۔ نئی صبح میں ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا۔ مجھے روپے کا انتظام کرنا تھا۔ لیکن مجھے تین ہزار روپے بھلا کون دے دیتا؟ میں سوچتا رہا اور پھر شاہی میرے تصور میں آ کھڑی ہوئی۔ شاہی میری زندگی بھر کا سرمایہ ——— میں نے اسے تمہارے لئے داؤ پر لگا دیا ——— باس کے لڑکے سے بات ہوئی۔ معاہدہ ہوا کہ وہ مجھے شادی کے بعد چار ہزار روپے دے گا، اس شرط پر کہ زندگی میں کبھی شاہی سے نہ ملوں۔ مجھے ہر شرط منظور تھی۔

شاہی کو جب علم ہوا تو میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے ہمیشہ میری خواہش کے سامنے سر جھکایا تھا۔ آج کیسے انکار کر دیتی؟

دونوں کی شادی ہو گئی۔ مجھے روپے مل گئے۔ شاہی کی شادی کی خبر سن کر تم بہت خوش ہوئیں۔ طرح طرح مجھے جتاتی رہیں کہ باہر کی عورتیں، گھر کی عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ تو صرف روپے کی ساتھی ہوتی ہیں ——— کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ روپے کی ساتھی شاہی نہیں میں تھا۔

شاہی اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی ——— میں تمہیں لے کر ویلور آ گیا۔ میری زندگی کا وہ دن بھی آ گیا، جس کے لئے میں نے اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا دی تھی۔ تمہارا آپریشن ہو گیا۔

لیکن جانتی ہو کیا ہوا؟

میری ساری کوششیں بے کار گئیں۔ میں قسمت سے دوبارہ ہار گیا۔ جب ڈاکٹر باہر آیا تو میں بے تابانہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا سوگوار ہاتھ میرے

کاندھے پر رکھ دیا۔ میرے کانوں نے دو چار تعزیتی جملے سنے ——— اور وہ آگے بڑھ گیا۔

میں تنہا کھڑا انتظار کرتا رہا

صبح نو مندرجہ ذیل نئی کتابوں کی اشاعت کی بشارت دیتا ہے۔

۱	حرف وفا	مجموعہ کلام جناب وفا ملک پوری
۲	پاداش (ناول)	از عصمت آرا
۳	ناشنیدہ	مجموعہ کلام جناب علیم اللہ حالی